بزمِ داغ



رفیق مارہروی

ایک ادبی شاہکار

بزمِ داغ

مرتبہٗ

رفیق مارہروی

قیمت

تین روپے چار آنے

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ٹیلیفون نمبر ۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمٰن
پرنٹر:۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

"تعارف"

۱۵؍ اگست سنہ ۱۸۹۸ء سے ۱۵؍ جون سنہ ۱۹۰۰ء تک مولانا احسن مارہروی اور مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی جو آپس میں چچا بھتیجے تھے اپنے استاد جناب فصیح الملک داغ دہلوی کی خدمت میں حیدرآباد حاضر رہے، حضرتِ داغ کے یہ موقع شناس شاگرد اپنے استاد کی خدمت میں حاضر رہ کر شبانہ روز جو دیکھتے اور جو سنتے لے وہ بطور روزنامچہ قلمبند کرتے رہے، آج وہی سب یادداشتیں جناب کی خدمت میں "بزمِ داغ" کے نام سے پیش ہیں۔

سید رفیق مارہروی

انتساب

یہ کتاب مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی اور مولانا احسن صاحب مارہروی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے لہذا اس کو ان دو مقتدر ہستیوں کے سوا کسی اور سے منسوب کرنا غیر مناسب ہوگا، مولوی افتخار عالم صاحب رشتے کے دادا اور حضرت احسن مارہروی میرے والد تھے یہ انہیں کے روحانی فیوض کا نتیجہ ہے کہ میں انکے بنائے ہوئے خاکوں میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں ؎

حکایت از قدِ آں یار دلنواز کنم
بہ ایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم

سید رفیق مارہروی

"افتتاحیہ"

نواب مرزا خاں داغؔ آخری کلاسکل دور کے بڑے خوش گو و پر گو شاعر تھے لیکن اگر وہ حیدر آباد پہنچ کر حضور نظام کے استاد بننے کا شرف حاصل نہ کر سکتے تو شاید آج انکی شاعری اتنی مقبول نہ ہوتی۔

دورِ مغلیہ کے عہدِ عروج کے بعد شعراء کی قدر افزائی ختم ہو چکی تھی اور جہانگیر و خانخاناں کا وہ زمانہ جب شاعروں کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا محض افسانہ ہو کر رہ گیا تھا، لیکن جب حضور نظام نے داغؔ کو اپنا استاد بنا کر انہیں اپنی شاہانہ نوازش سے مالا مال کر دیا تو عہدِ مغلیہ کی وہ دیرینہ روایات پھر زمانہ کو یاد آگئیں اور دنیا کی نگاہیں داغ کی طرف اٹھنے لگیں اور داغؔ کی شاعری، انکی زندگی، انکے معمولات اور انکی ذاتی خصوصیات وغیرہ تمام باتیں "نقد و تاریخ" کی حدود میں آگئیں۔

داغ کا قیام رام پور میں بھی رہا لیکن دوسرے درباری شعراء میں ممتاز رہنے کے باوجود وہ کوئی خاص توجہ نہ نواب کی حاصل کر سکے نہ خواص کی، یہاں تک کہ وہ یہاں کی فضا سے ایک حد تک مایوس ہو کر واپس آگئے لیکن چونکہ قدرت کو ان کی زندگی کا ایک نیا ورق الٹنا تھا، اس لئے انہوں نے دکن کا رُخ کیا اور سالہا سال کے صبر آزما انتظار کے بعد آخر کار وہ گھڑی آئی جس کی موہوم سی تمنا لے کر داغ حیدر آباد گئے تھے۔

داغ حیدرآباد پہونچنے کے بعد آخر عمر تک وہیں رہے اور بڑے امیرانہ طمطراق کے ساتھ رہے پھر اس طویل زمانہ میں انھوں نے وہاں کس طرح زندگی بسر کی یہ جاننے کی خواہش تو سب کو تھی لیکن اس کا صحیح علم صرف ان دو خصوصی شاگردوں جناب احسن مارہروی اور جناب افتخار عالم مارہروی کو تھا جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور تمام واقعات کو قلمبند کرتے رہتے تھے اور یہی وہ روزنامچہ یا یادداشت ہے جسے جناب احسن مارہروی کے صاحبزادہ جناب رفیق مارہروی نے "بزم داغ" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ داؔغ نے حیدرآباد میں کس طرح زندگی بسر کی، انکے مشاغلِ حیات کیا تھے، انکی اصلاح کا طریقہ کیا تھا۔ امرار دکن سے انکے تعلقات کیا تھے، نظام انکی کتنی عزت کرتے تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ داؔغ کی اندرونی زندگی کس قدر دلچسپ و رنگین تھی ـــــ اگر جناب رفیق مارہروی اس قیمتی یادداشت کو پبلک میں نہ لاتے تو شاید ہم کبھی ان حالات سے واقف نہ ہوسکتے جن کا علم داغ اور داغ کی شاعری سمجھنے کے لئے ایک "مورخ و نقاد" دونوں کے لئے ضروری ہے۔

نیاؔز فتحپوری

لکھنؤ ۱۳؍ نومبر ۱۹۵۶ء

"پیش لفظ"

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے شاگردوں میں بعض کو ہی یہ فخر حاصل ہو سکا کہ وہ کچھ عرصے انکی خدمت میں حاضر رہے اور بالمشافہ ہم کلامی و ہم نشینی کا شرف حاصل کیا، ایسے شاگردوں میں کچھ تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو حیدر آباد یا اطراف حیدر آباد کے رہنے والے تھے، ایسے خوش نصیب افراد میں میر حسن علی خاں امیر، جناب تجلی، اور میر مردان علی وغیرہ کو خاص درجہ حاصل تھا، بیرونی شاگردوں میں مولانا احسن صاحب مارہروی، مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی، حضرت نوح ناروی، مستجاب خاں خلق، عبدالمجید آزاد اور مظفر حسین بارق وغیرہ کو خاص شہرت حاصل تھی ان لوگوں میں سے بعض مرزا داغ کی زندگی کے آخری لمحات تک "بزم داغ" کی رونق بنے رہے

مذکورہ بالا شاگردوں میں مولانا احسن صاحب مارہروی اور مولوی افتخار عالم صاحب بڑے موقع شناس اور عملی انسان تھے، انھوں نے اپنی شبانہ روز کی حاضری کو نشستند و گفتند و برخاستند تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کچھ مفید کام کئے، مولانا احسن صاحب نے فصیح اللغات جیسی بے نظیر لغت کی، داغ بیل حیدر آباد کے قیام کے زمانہ ہی میں ڈالی تھی، اس لغت میں الفاظ کی تشریح و توجیہہ کے لئے حضرت داغ کے اشعار بطور سند دیئے گئے تھے، اس لغت کی ترتیب و تنظیم میں جہاں خود مولانا احسن صاحب

کے ذوق و شوق اور ان کی مساعی کو دخل تھا وہیں حضرت داغ بھی اپنے شاگرد کی ہمت افزائی میں دریغ نہیں کرتے تھے، جن الفاظ کی سندیں انکے پچھلے کلام سے دستیاب نہ ہو سکیں ان کی سند میں بڑے شوق سے تازہ اشعار فرما دیا کرتے تھے، یہ لغت کسی حد تک ہی لکھا جا چکا تھا کہ مولانا احسن اپنی بعض خانگی ضروریات سے مجبور ہو کر وطن چلے آئے، وطن پہنچکر ایسے جھمیلوں میں پھنسے کہ پھر استاد کی زندگی میں حیدرآباد نہ پہنچ سکے، لغت کا جسقدر حصہ مرتب ہو چکا تھا وہ کتابی شکل میں تو شائع نہ ہو سکا مگر اس کے بعض ابتدائی حصص رسالہ فصیح الملک[1] میں شائع ہوئے اور بہت پسند کئے گئے۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنے قیام حیدرآباد اور مرزا داغ کی ہمنشینی سے یہ بھی فائدہ اٹھایا کہ انہوں نے ایک روزنامچہ کی داغ بیل ڈالی اور حضرت داغ کی روزمرہ زندگی کے پوست کندہ حالات لکھنا شروع کئے، وہ شب و روز جو دیکھتے، اور سنتے اسے قلم بند کر لیتے، مرزا داغ کی گذشتہ لائف سے متعلق بھی اکثر امور خود مرزا صاحب سے دریافت کر کے یا بر سبیل تذکرہ سن کر یا بعض دوسرے ذرائع سے معلوم کر کے انہوں نے قلمبند کئے۔ اس روزنامچے کی ترتیب و تکمیل میں مولانا احسن صاحب کے ساتھ ساتھ مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی کو بھی پورا پورا دخل رہا، دونوں چچا بھتیجے تھے ایک جگہ رہتے تھے جس کو

---

[1] رسالہ فصیح الملک مولانا احسن صاحب مارہروی نے اپنے استاد کی یادگار کے طور پر نکالا جاری ہا تھا جو داغ اسکول کا ایک کامیاب اور مقبول ادبی رسالہ تھا، عرصے تک جاری رہا۔

جس وقت بھی موقع ملتا جو دیکھتا اور جو سنتا اسے فوراً ضبطِ تحریر میں لے آتا
مولوی افتخار عالم صاحب کچھ عرصہ کے بعد جب وطن چلے آئے تو فصیح اللغات
کے ساتھ ساتھ اس روزنامچے کی ترتیب و تحریر بھی کلیتاً مولانا احسن صاحب کے ہی
ذمہ ہوگئی اور انہوں نے اس روزنامچے کو جو وسط اگست ۱۸۹۸ء سے شروع
ہوا تھا وسط جون ۱۹۰۲ء تک جاری رکھا۔ لیکن افسوس مولانا کی واپسی وطن
کی بنا پر فصیح اللغات کی طرح یہ روزنامچہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا اور اس
طرح دو مفید ترین تالیفات نامکمل رہ گئیں۔ مرزا داغ کی سوانحعمری "جلوۂ داغ"
حضرت احسن نے انہیں یادداشتوں کی مدد سے تالیف فرمائی تھی۔ جو اگرچہ
کئی حیثیتوں سے نامکمل ہے مگر اس کے مستند ہونے سے انکار نہیں کیا
جاسکتا۔ "جلوۂ داغ" کے متعلق خود مولانا اپنے ایک مضمون[1] "داغ و احسن"
میں فرماتے ہیں :-

"جلوۂ داغ کے نام سے ڈیڑھ سو صفحوں کی سوانحعمری لکھ چکا ہوں،
بیشتر واقعات ایسے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ و اقتضا کی مجبوری
سے صاحبِ سوانح کی زندگی میں ممنوع الاشاعت یا محفوظ الکتابت
رہا کرتے ہیں، جلوۂ داغ کئی حیثیتوں سے نامکمل سوانحعمری ہے"

مولانا کی محولہ بالا تحریر جن ممنوع الاشاعت اور محفوظ الکتابت حالاتِ
زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ واقعات وہ ہیں جن کا تعلق مرزا صاحب کی

---

[1] مطبوعہ علی گڑھ میگزین

شاہد پرستانہ زندگی سے ہے۔ مرزا داغ نے ہمیشہ علی الاعلان اپنی شاہد پرستیوں کا اظہار و اقرار کیا لیکن ان کے غیرت مند شاگرد نے محض پاسِ ادب سے اس قبیل کے تمام واقعات کو "جلوۂ داغ" سے حذف کر دینا ہی بہتر و اصوب متصور فرمایا۔ انہوں نے صرف وہی واقعات پیش کئے جو سنجیدہ و متین کہے جا سکتے ہیں، مرزا داغ کی وفات کے بعد انہیں یادداشتوں کی مدد سے انہوں نے متعدد مضامین بھی لکھے لیکن ان واقعات و حالات کو انہوں نے بدستور مخفی رکھا اور استاد کے حفظ ناموس کے معاملہ میں جو احتیاط انہوں نے انکی زندگی میں ضروری متصور کی تھی اس پر وہ انکی وفات کے بعد بھی نہایت سختی سے قائم رہے۔

مولانا کی زندگی میں بھی یہ مسودہ میری نظر سے گزرا، مولانا کو بعض احباب سے میں نے یہ کہتے بھی سنا کہ اگرچہ مرزا داغ کی زندگی کو واضح کرنے کے لئے ان واقعات کا اظہار بہت دلچسپ اور مفید رہیگا لیکن ابھی قدر دانِ داغ اتنے روادار اور آزاد خیال نہیں ہو سکے ہیں کہ وہ ان واقعات کے اعلان و اشتہار پر خشمگیں یا چیں بر جبیں نہ ہوں لہذا بحالت موجودہ ان واقعات کا اخفا ہی مناسب و بہتر ہے لیکن بہت جلد وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی واقعات جنہیں میں اپنی دانست میں ممنوع الاشاعت متصور کرتا ہوں، جلی عنوانوں سے شائع ہونگے، لوگ ایک ایک واقعہ کی چھان بین کریں گے، افسانوں کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ کا رنگ دیا جائے گا اور انہیں مباحث کے مواجہ میں مرزا داغ پر زبردست ریسرچ ہوگی،

مولانا کا یہ ارشاد لفظ بہ لفظ پورا ہوا، اگست ۱۹۴۸ء میں ایک دوست کے اصرار سے انہیں واقعات پر مشتمل میرا ایک مضمون بعنوان "داغ اور منی بائی حجاب" رسالہ نگار میں شائع ہوا جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس قبیل کے مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، رسالہ نگار کا "داغ نمبر" بھی اسی سلسلے کی ایک مفید تالیف ہے جس میں مخصوص اس موضوع پر بعض اہل قلم حضرات نے کافی مواد پیش کیا ہے۔

مولانا احسن صاحب مارہروی نے مرزا داغ کے خطوط "انشارِ داغ" کے نام سے مرتب کئے تو بھی احتیاط ملحوظ رہی اور مرزا داغ کی حسن پرستی، شاہد نوازی اور لذت پرستی پر گواہی دینے والے بہت سے خطوط شامل اشاعت نہیں فرمائے اور خطوط فراہم نہ ہو سکنے کا عذر کر کے ٹال گئے۔ لیکن جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ مرزا داغ کے ایسے خطوط[1] بھی منظرِ عام پر آ گئے جو درحقیقت ان کی حیاتِ معاشقہ کے بڑے دلچسپ نقوش ہیں۔

مرزا داغ کی زندگی کے ایسے واقعات جب آزادانہ منظرِ عام پر آنے لگے تو مجھے خیال ہوا کہ مولانا احسن صاحب مارہروی اور مولوی افتخار عالم صاحب کی لکھی ہوئی یادداشتوں کا اب زیادہ عرصہ تک مخفی رکھنا مناسب نہیں اور جو چیز آج کم و بیش پچاس سال سے بطور شجرِ ممنوعہ میرے گھر میں محفوظ ہے

---

[1] خطوطِ داغ کا ایک دلچسپ مجموعہ "زبانِ داغ" نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے اہتمام سے شائع کرا چکا ہوں جو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے پہلی چیز ہے۔

اس کا اب منظرِ عام پر آجانا ہی مناسب ہے، اس خیال کے پیدا ہوتے ہی میں نے مسودے پر نظر ڈالی، تمام یادداشتوں کو بار بار پڑھا، منتشر اور نامربوط انداز میں لکھی ہوئی ان یادداشتوں کو دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی ان کو بجنسہٖ پیش کرنا مشکل نظر آیا، یہ سب یادداشتیں بغیر کسی عنوان کے درج تھیں، بعض یادداشتوں پر تاریخ تحریر بھی درج نہیں تھی۔ روش تحریر اتنی رواں تھی کہ بعض مقامات کا پڑھنا مشکل تھا، بیشتر واقعات سے متعلق صرف اشارے لکھ دیئے گئے تھے جن پر مکمل نوٹس وہی مرتب کر سکتا تھا جو یا تو خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکا ہو یا داغ کی زندگی پر اس کا وسیع ترین مطالعہ ہو، یہ یادداشتیں کس ڈھنگ اور کس طریقہ سے لکھی گئی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے خود مولانا احسن مارہروی کی ایک تحریر ملاحظہ فرمایئے

"یہ تمام واقعات اگرچہ مرزا داغ کے ہی متعلق ہیں مگر ان کو مکمل
سوانحِ عمری نہ سمجھا جائے بلکہ وہ کچھ نامربوط و منتشر حالات ہیں جو چند
سالوں تک بغیر کسی عنوان و ترتیب کے قلم بند کئے گئے ہیں"[1]

اس مسودۂ یادداشت کی مذکورۂ بالا ریختہ حالت سے عہدہ برآ ہونا مجھے بہت مشکل نظر آیا، لیکن میں مایوس نہیں ہوا، برابر غور و فکر کرتا رہا۔ بعض کرم فرماؤں[2] سے مشورے بھی کئے اور بالآخر یہی ایک صورت قابلِ عمل

---

[1] دیکھو مضمون "داغ کی صحبت میں" موشومہ رسالہ کلیم دہلی

[2] ایسے کرم فرماؤں میں جناب تمکین صاحب کاظمی اور سید فاضل زیدی شاہ پوری وارد حال پاکستان کو خصوصیت حاصل ہے جنہوں نے نہ صرف مفید مشورے دیئے بلکہ بعض ایسی ضروری باتیں بتائیں کہ جن کے بغیر اس کتاب میں مفید و صحیح حواشی کا اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔

نظر آئی کہ اس روزنامچے کی تمام یادداشتوں کو ان کے اصل مفہوم میں ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر از سر نو لکھا جائے۔ چنانچہ اس کتاب کی بیشتر یادداشتیں ایسی ہیں جو میری زبان میں تحریر ہوئی ہیں لیکن مفہوم مولانا احسن صاحب یا مولوی افتخار عالم صاحب کا ہی ہے۔ تلمیح طلب امور کی توجیہہ مختلف نوٹس اور حواشی کے ذریعہ کردی گئی ہے اور اس طرح ایک بے ترتیب اور نامربوط یادداشتوں کے مجموعے کو حتی الوسع کارآمد اور دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے مجھے کتنی محنت اور کس قدر کدوکاوش کرنا پڑی اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنکو کسی مسمار عمارت کو اپنی اصل بنیادوں اور قدیم شکل میں تبدیل کرنے کے مواقع ملے ہوں، محنت تو مجھ سے جسقدر ممکن تھی اس سے میں نے دریغ نہیں کیا، لیکن وقت میرے پاس کم تھا۔ ایک مدت تک تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر یہ کام جاری رکھا اور مجھے مسرت ہے کہ ایک مدت کی کوشش کے بعد آج میں اس قابل ہوسکا ہوں کہ ۵۰ سال پہلے کی بے ترتیب اور غیر مربوط تحریروں اور مرزا داغ کی حیات معاشقہ کی ان تمام رنگین تصاویر کو جو دھندلی پڑ چکی تھیں اپنے اصلی و حقیقی رنگ میں پیش کرسکا ہوں۔

مرزا داغ پر ان کے مخالفین کا سب سے پہلا اور سنگین اعتراض ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ رند و شاہد باز تھے، اس حقیقت کا اعتراف دبی زبان سے داغ کے قدردانوں نے بھی کیا ہے۔ داغ کی آزادروی و حسن پرستی کا اثر انکی شاعری پر بھی پورا پورا ہوا۔ فطری احساسات سے کوئی جاندار خالی نہیں، نفسیاتی کیفیات کی پذیرائی سے کسی کو مفر نہیں اگر کوئی شخص ان جذبات سے عہدہ برآ ہونا چاہے

تو یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، نفسانی کیفیات کا ذکر علی الاعلان کیا جائے یا اشاروں اور کنایوں میں بہر حال اپنے مفہوم اور مطلب کے اعتبار سے انہیں مختلف معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔ داغ بے چارے کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ خلوت و جلوت کا امتیاز نہیں کرتے تھے، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ وہی ظاہر کرتے جو دل میں ان کے ہوتا، فطرت کے تقاضوں پر انہوں نے ہمیشہ علی الاعلان لبیک کہا وہ:۔

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

کے نہ قائل تھے نہ عامل، انہوں نے گانا سنا اور گانے والیوں کو نوکر بھی رکھا شاہدانِ بازاری سے محبت بھی کی اور بازارِ حسن کے خوب خوب چکر بھی کاٹے مگر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر نہیں بلکہ کھلے خزانے، انہیں اپنی اس نوع کی زندگی کے اعلان و اشتہار میں بھی کبھی پس و پیش نہیں ہوا۔ ان کی شاعری ان کے اس وصف کا اعلان ہے، داغ کی شاعری میں داغ کی صحیح اور سچی زندگی جلوہ گر ہے مرزا داغ کا ایک ایک شعر ان کی زندگی کی سچی تفسیر ہے، مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال چل گئے
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

اس شعر میں جن جذبات کا اظہار ہے ان کی عمومیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا شعر کا ایک ایک لفظ مظہر ہے کہ مرزا داغ بہت آزاد، بہت بے باک اور بڑے ہی رنگین مزاج تھے، اس شعر کے مواجہہ میں آپ مرزا داغ کی زندگی کا صحیح تصور

کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ ان کی شاعری ان کے حالات سے کتنی متوازن تھی۔

مرزا داغ کے ہمعصروں میں حضرت امیر مینائی کی شخصیت سے ہم سب واقف ہیں وہ نہایت مہذب، بڑے متین اور انتہائی نیک طبع واقع ہوئے تھے وضع قطع بھی بالکل درویشانہ رکھتے تھے، ایک پیر طریقت کے سجادہ نشین بھی تھے صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند اور داغ سے بالکل مختلف ومتضاد زندگی کے حامل تھے، ان کی اس پارسا زندگی کو ذہن نشین کر کے اب آپ ان کا ایک شعر سنئے اور اس شعر میں حضرت امیر کی مقدس ونورانی زندگی کا پس منظر تلاش کیجئے شعر ہے

؎ لپٹا ہیں بوسے لے کے تو بولے کہ دیکھئے
یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا

ایک ہی مفہوم میں داغ وامیر کے یہ دونوں اشعار ہیں، لیکن فطرت کے تقاضوں کے اظہار میں حضرت امیر، داغ جیسے رندِ مشرب کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں بیباکی وتیز دستی میں ایک مولوی ایک رند شاہد باز کے مقابلہ میں بہت بے تکلف نظر آرہا ہے اور فطری جذبات کی پذیرائی میں بہت تیز دم ہے۔ ایسے حالات میں کہ ایک پاکباز بھی ایک شاہد باز کی طرح فطرت کے آگے مجبور محض ہے، داغ کی تمام شاہد پرستیاں وحسن نوازیاں قابل معافی اور ناقابل گرفت ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

حضرت داغ کی زندگی درحقیقت، مجموعہ تھی مختلف و متضاد اوصاف کی، ان کی زندگی صرف حسن و عشق سے ہی ہم ردیف نہیں تھی بلکہ وہ جس طرح نغمہ و حسن کے دلدادہ و رسیا تھے بالکل اسی طرح ان پر مذہبی رنگ بھی سوار تھا، وہ نماز روزے کے پابند تھے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے تھے اپنی آمدنی کا مناسب حصہ بطور زکوٰۃ بھی دیتے تھے، غریبوں اور بیواؤں کی کفالت میں بھی سب سے آگے تھے، وہ بڑے کنبہ پرور اور غریب نواز تھے، آپ اس مختصر کتاب میں داغ کے ان اوصاف سے متعلق مختلف و متنوع ابواب دیکھیں گے، کہیں آپ ان کے مذہبی معتقدات کا ذکر پائیں گے تو کہیں ان کی آزادہ روی و آزادہ منشی کا تذکرہ ہوگا کسی جگہ ان کی معاشرت، طرز زندگی، افتادِ طبع اور اخلاق و عادات کا مذکور ہے تو کہیں ان کی زندگی کے معمولات کا مفصل حال درج ہے، کسی باب میں اگر ان کی ادبی بذلہ سنجیوں اور شاعرانہ فہم و ادراک کی وضاحت کی گئی ہے تو کسی جگہ ان کے ایسے لطائف و ظرائف درج ہیں جو ان کی ذہنی رسائی پر دال ہیں۔ اس کتاب کے سب سے دلچسپ اور جاذبِ توجہ وہ ابواب ہیں جن میں واقعاتِ حسن و عشق کا مذکور ہے، ان ابواب میں ایک شاعر کی رنگین و حسین زندگی کے کچھ ایسے سچے واقعات درج ہیں جنکے ملاحظہ کے بعد داغ کی زندگی کے تمام حجاب دور ہو جاتے ہیں۔ کتاب گو مختصر ہے لیکن بعض ایسے متنوع بیانات و حالات پر حاوی ہے کہ انکے ملاحظے کے بعد حضرت داغ کی پوری زندگی سامنے آجاتی ہے، واقعاتِ داغ کا کوئی پہلو خواہ وہ انکی روزمرہ زندگی سے متعلق ہو یا انکی حیاتِ شاعرانہ سے، ان کے حسن پرستانہ ولولوں سے اسکا تعلق ہو یا انکی پس پردہ

سرمستیوں سے بہرحال آپ اسے تکلف و آورد سے پاک پائیں گے وہ تمام پردے جو داغ کی زندگی پر محتاط تذکرہ نویسوں نے ڈال رکھے ہیں آپ کو چاک چاک نظر آئیں گے اور وہ تمام امور جو کل تک ممنوع الاشاعت اور محفوظ الکتابت تھے اس کتاب میں مرزا داغ کے ہی الفاظ میں اس شعر کے مصداق ملیں گے ؎

وہ حالِ طبیعت جو برسوں چھپایا
ہر اک شخص سے اب بیاں ہو رہا ہے

ہو سکتا ہے کہ اس کتاب میں بعض مقامات واقعاتی و روائتی اعتبار سے کسی تفاوت و تضاد کے حامل نظر آئیں اور بعض تحریری اثبات سے انکی تکذیب ممکن ہو۔ اس تضاد و فرق کی ذمہ دار اصل مسودہ کی وہ مبہم و نامربوط تحریریں ہیں جو باوجود کوشش میری سمجھ میں نہ آسکیں اور میں اپنی کمی معلومات کی بناپر ان مبہم عبارتوں کی مناسب حال تشریح و وضاحت نہ کر سکا۔ میرے بعض کرم فرماؤں نے مجھے رائے دی کہ اس قسم کی تمام تحریروں کو مسودے سے حذف کر دیا جائے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔ صرف اس بنا پر کہ اس قسم کی متنازعہ باتیں ہی کبھی کبھی مفید و کار آمد بحث کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور یہی واقعاتی اختلاف اور نظریاتی تفاوت بڑے اچھے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ کیا عجب کہ "بزمِ داغ" کے وہ چند ابواب جو خود میری نظر میں بھی توجیہہ طلب اور کسی قدر مشکوک ہیں ملک کے نکتہ ور و دقیقہ رس دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور ان کی تلاش و تحقیق سے وہ خامی

دور ہو جائے جسے میں اصل مسودے کی بے ربطی و بے ترتیب طرزِ تحریر نیز اپنی بے علمی و ناواقفیت کی بنا پر باوجود کوشش دور نہیں کر سکا۔

سید رفیق احمد مارہروی
بدایوں ۲۸ راگست ۱۹۵۶ء

۱۵ اگست ۱۸۹۵ء

جب میں[1] اپنے ہم زلف سید کاظم علی صاحب شوکت بلگرامی کے ساتھ جو دارالشفا حیدرآباد میں رہتے تھے نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے خدمت میں شرف قدم بوسی حاصل کرنے کیلئے پہلی بار حاضر ہوا تو میرے دل کا عجیب حال تھا۔ مرزا صاحب سے فیض تلمذ کو دو تین سال گزر چکے تھے اور ذریعہ خط و کتابت طرفین میں خاصا تعلق اور واقفیت تھی لیکن صوری ملاقات کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دل دھڑک رہا تھا اور اشتیاق قدم بوسی میں بے اختیار ہوا جاتا تھا۔ استاد کا قیام افضل گنج میں تھا۔ ہم لوگ صبح آٹھ بجے پہونچے اطلاع کرائی فوراً طلب ہوئے اسوقت مرزا صاحب کے پاس دو شخص اور بیٹھے ہوئے تھے، ایک میر حسن[2] علی خاں صاحب اور دوسرے بارق[3] صاحب، بڑی محبت

---

[1] مولانا احسن مارہروی

[2] نواب میر حسن علی خاں، حیدرآباد کے رؤسا و شرفا میں سے تھے، داغ کے شاگرد اور ایک بے تکلف و رازدار دوست تھے۔ ۱۲۸۰ھ سال ولادت ہے، سید محمد صاحب نامی ایک بزرگ آ دُرنگ زیب کے زمانہ میں حیدرآباد پہونچے، صاحب منصب و جاگیر ہوئے اسی جاگیر کا کچھ حصہ اولاد صلبی ہونے کی بنا پر حسن علی خاں صاحب کو بھی ملا۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

[3] پورا نام مظفر حسین اور بارق تخلص تھا، تلگوکنڈہ کے مدرسے میں مدرس تھے (باقی صفحہ ۲۲ پر)

سے استاد نے ہمیں لیا مجھے دیکھ کر بہ یک نظر پہچان لیا، سلام و جواب کے بعد پہلا جملہ جو زبانِ استاد سے ادا ہوا وہ یہ تھا:۔

"اب تو آپ مسلمانوں کی صورت نظر آتے ہیں۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دفعہ آگرے میں برادرم شوکت بلگرامی کے ہمراہ انہیں کے لباس یعنی سوٹ بوٹ میں میں نے تصویر کھنچوائی تھی اور اس فوٹو کی ایک کاپی استاد کی خدمت میں بھی بھیجی تھی جو ایک ہفتے کے بعد ہی مجھے اس تحریر کے ساتھ واپس ملی کہ :۔

ایک سید اور حافظ و حاجی کو میں اس شکل میں دیکھنا نہیں

چاہتا۔

گو میری تصویر ایک نظر دیکھ کر واپس کر دی گئی تھی لیکن جب ملاقات ہوئی تو مرزا صاحب نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا، شوکت بلگرامی سے مرزا صاحب پہلے سے واقف تھے، بولے آپ لوگوں سے آج مل کر مجھے بہت مسرت ہوئی، احسن صاحب نے اپنی آمد سے مطلع تو ضرور فرمایا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے پاس ہی ٹھہریں گے لیکن مجھے شوکت صاحب سے بہت شکایت ہے کہ انہوں نے

(بقیہ صفحہ ۲۱) داغ کے اولین شاگردوں میں سے تھے داغ کی زندگی تک ہر جمعرات کی رات کو معمولاً تشریف لاتے، جمعہ کا دن گزار کر واپس جاتے، علاوہ جمعہ، جمعرات کے بھی جب موقع ملتا استاد کی خدمت میں حاضر رہتے، استاد کی وفات تک اس معمول میں فرق نہ آیا۔ داغ کی وفات کے کچھ عرصے بعد انتقال کیا۔

میرے مہمان کو مجھ سے چھین لیا، دیر تک باتیں کرتے رہے اور حالات پوچھتے رہے، جب میں نے رخصت ہونا چاہا تو حکم ہوا کہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے کھانا کھا کر تشریف لے جائیے گا۔ الغرض میں اس روز کھانا کھا کر قیام گاہ واپس ہوا۔

---

۱۸ راگست ۱۸۹۸ء

تقریباً روز مرزا صاحب کی خدمت میں حاضری ہو رہی ہے، مرزا صاحب کے شاگردوں اور احباب سے ملاقات ہو رہی ہیں، آج مستجاب خاں قلق[1]، جناب تجلی[2]، عبدالحمید صاحب[3] آزاد سے ملاقات ہوئی، یہ سب لوگ استاد بھائی

۱؎ مستجاب خاں نام خلق تخلص تھا حیدرآباد کے باشندے تھے، داغ کے شاگرد تھے، خوش حال و فارغ البال تھے، شاعر تو برائے نام ہی تھے لیکن بڑے سخن فہم و سخن شناس تھے داغ کی صحبت میں رہتے تھے اور داغ کے شاگردوں اور احباب سے دوستانہ و برادرانہ مراسم تھے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ انتقال کیا۔

۲؎ جناب تجلی مرزا داغ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے خاندانی شاعر تھے اور حیدرآباد کے شرفا میں شمار تھا انکے والد سیادت علیخاں حافظی تخلص کرتے تھے، دادا کا تخلص شیدا تھا تجلی نے آغا شستری اور ترکی علی ترکی سے بھی اصلاح لی، داغ کے حیدرآباد پہونچنے پر داغ کے شاگرد ہو گئے، حیدرآباد میں صدر خزانہ دار یعنی ٹریزری آفیسر تھے ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا

۳؎ عبدالحمید نام آزاد تخلص تھا بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپکا نام ابوالحمید تھا، داغ کے محب خاص تھے، وکالت کرتے تھے، آخر عمر میں وکالت چھوڑ کر محکمۂ رجسٹریشن میں رجسٹرار ہو گئے تھے، بہت کم گو شاعر تھے، مگر زندہ دل، بذلہ سنج اور یار باش بزرگ تھے۔

ہیں، بڑے با اخلاق ہیں، استاد کے یہاں برابر حاضری دیتے ہیں، نواب حسن علیخاں امیر اور مظفر حسین بارق سے پہلے ہی روز ملاقات ہو چکی ہے صبح و شام استاد کے یہاں ہم سب شاگردوں کی نشست رہتی ہے اور ہم لوگ فیض پاتے ہیں، درحقیقت ہم لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ داغ جیسے مشہور شاعر کی صحبت کی ہمیں عزت حاصل ہے۔

۲۰ راگست ۱۸۹۸ء

رسائی و پذیری کے بعد مرزا داغ نے سب سے پہلی خدمت جو مجھے تفویض کی ہے وہ ہر جمعرات کو بزرگانِ دین اور احباب متوسلین کا فاتحہ دینا ہے، مرزا صاحب کے معمولات میں ہے کہ وہ ہر جمعرات کو مذکورہ بالا بزرگوں کی فاتحہ دلوایا کرتے ہیں، پہلی جمعرات کو جب میں تعمیل ارشاد کے لئے اٹھا تو فرمایا کہ وہ فہرست تو لے لیجئے جس میں ان لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں، جن کی فاتحہ دی جائیگی، اپنے قلمدان سے ایک فرد نکلوا کر دی دیکھا تو بلا شبہ اسمار حسنیٰ سے بھی زیادہ اسم نویسی اس میں کی گئی تھی سلاسل صوفیہ کا کوئی مشہور بزرگ طبقہ شعرار کا کوئی نامور سخنور، گروہ اعزا و احبا کا کوئی مخصوص زن و مرد، ایسا نہیں تھا جس کا نام اس فہرست میں نہ ہو، شیرینی اور طعام کو دیکھا تو وہ بھی ۲۰ - ۲۵ خوراکوں کے لئے کافی —— مرزا صاحب کا یہ معمول ہمیشہ سے چلا آتا ہے، فرماتے ہیں کہ رامپور کے قیام میں بھی یہی عمل درآمد رہا اور اب حیدرآباد آنے کے بعد بھی یہ دستور جاری ہے۔

مرزا صاحب اپنے معمولات کے بہت پابند ہیں، وہ صبح نماز پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے مکان[1] کے اوپر کی منزل میں جہاں عام نشست رہتی ہے تشریف لے آتے ہیں، ایک آرام کرسی پر خود تشریف رکھتے ہیں، آس پاس دوسرے لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی ہوتی ہیں، ایک میز پر قلم دوات اور خطوط رکھے ہوتے ہیں، یہ وقت عام طور سے خطوط کے جواب دینے کا ہوتا ہے اور اسی موقع پر شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی ہوتی ہے، ۱۱ بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوتی ہے، مکان کے نچلے حصے میں دسترخوان بچھتا ہے اور مرزا صاحب کھانا تناول کرتے ہیں، دسترخوان پر عام طور سے دو چار حاضر باش شاگرد ضرور ہوتے ہیں، کھانے کے بعد مرزا صاحب پلنگ پر پہونچ جاتے ہیں۔ پیچوان سامنے لگا دیا جاتا ہے، نواب علی حسن خاں اگر ہوتے ہیں تو ان کے لئے گڑگڑی حقہ آتا ہے اور اس طرح دو ڈھائی گھنٹے مرزا صاحب آرام کرتے ہیں، ظہر کے وقت اٹھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد شطرنج کھیلتے ہیں اسی موقع پر مقامی شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح ہوتی ہے، شاگرد خود شعر پڑھتا جاتا ہے اور اصلاح لیتا جاتا ہے، نماز عصر کے بعد یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے اور مرزا صاحب جوڑی پر سوار ہو کر سیر

---

[1] یہ مکان محبوب گنج میں واقع تھا، مرزا صاحب ایک عرصے تک اس میں رہتے پھر آپ بازار عابد شاپ سے متصل ایک کوٹھی میں اٹھ گئے اور آخر وقت تک وہیں رہے۔

کے لئے نکلتے ہیں، ہواخوری کے لئے زیادہ تر سکندرہ آباد، حسین ساگر یا باغ عام کی طرف تشریف لے جاتے ہیں، سواری میں خود ہمیشہ صدر میں دائیں جانب بیٹھتے ہیں، بائیں جانب عام طور سے نواب حسن علی خاں کو جگہ ملتی ہے آگے کی نشستوں پر حاضر باش شاگردوں میں جو موجود ہوتا ہے بیٹھتا ہے الغرض مرزا صاحب کی سواری بڑی شان سے نکلتی ہے، مغرب سے قبل واپسی ہوتی ہے۔ نماز مغرب پڑھ کر پھر نشست ہوتی ہے، لیکن ایسے موقع پر عام طور سے مرزا صاحب گانا سنتے ہیں، گانا زیادہ تر صائب جان[1] طوائف کا سنتے ہیں جو آجکل مرزا صاحب کی ملازم ہے، یا رحمت اللہ[2] قوال کا گانا ہوتا ہے، عشا کی اذان کے ساتھ یہ محفل ختم ہوتی ہے، بعد نماز عشا کھانا تناول فرماتے ہیں اور آرام فرماتے ہیں لیکن سونے سے قبل اگر کوئی غزل کہنا ہوتی ہے

---

[1] صائب جان طوائف آگرے کی رہنے والی تھی، صورت شکل میں تو زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن گانے میں ماہر تھی اور اسے چوٹی کا کلام یاد تھا، حاضر جواب بلا کی تھی اسکی ظرافت و طباعی کی تعریف اکثر مرزا صاحب بھی کیا کرتے تھے۔

[2] ۔ رحمت اللہ درحقیقت قوال تھا، پکے گانے کا بھی ماہر تھا، مرزا صاحب کے پاس مستقل ملازم تھا۔ ویسے تو مرزا صاحب کے پاس، اور بھی متعدد گویئے ملازم رہے لیکن جو شخص مستقل طریقے سے مرزا صاحب کی عمر کے آخری لمحات تک ملازم رہا وہ رحمت اللہ قوال تھا۔ مرزا داغ رحمت اللہ کی بڑی قدر کرتے تھے اور رحمت اللہ بھی داغ کے سچے جاں نثاروں اور نمک حلالوں میں تھا۔

تو اس کی فکر کرتے ہیں اور جب تک پوری غزل نہیں کہہ لیتے، سوتے نہیں ہیں، رات کو مشکل سے ۳ - ۴ گھنٹے آرام کرتے ہیں، جس وقت آنکھ کھلتی ہے اسی وقت ملازم کو آواز دی جاتی ہے، وہ حقہ بھر کر پیش کرتا ہے، حقہ پی کر ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں اور اول وقت نماز فجر ادا کرتے ہیں۔

۲۲ راگست ۱۸۹۵ء

کلکتے کے ایک صاحب[1] آج مرزا صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ کلکتہ میں تجارت کرتے ہیں، شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، بڑی دیر تک مرزا صاحب کلکتہ کا حال پوچھتے رہے، نوکر تھوڑی دیر کے بعد پان لے کر حاضر ہوا، مرزا صاحب نے اشارہ کیا اور پان پہلے کلکتے والے صاحب کے سامنے پیش ہوئے، کلکتہ والے صاحب نے دوسری طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ پہلے وہاں سے تقسیم کرو، مشارٌالیہ کے پاس پان لائے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں پہلے کلکتے والے صاحب کو پیش کرو مگر کلکتہ والے صاحب نے پھر تکلف سے کام لیتے ہوئے پان نہ لیا اور اصرار کیا کہ پہلے ادھر سے، آپس میں دیر تک ردوبدل ہوتا رہا کوئی پان کھانے میں سبقت

---

[1] غالباً شیخ عبدالرزاق شاد سے مراد ہے جو کلکتہ کے بہت مشہور تاجر تھے اور مرزا داغ کے مخصوص احباب میں انکا شمار تھا۔ انکے والد کا نام شیخ اللہ دیا تھا جو نواسے تھے شیخ جیون بخش کے جو کلکتہ کے مشہور تاجر تھے اور لاہور کے مشہور تاجر رحیم بخش کی دختر سے شادی ہوئی تھی ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

نہیں کرتا تھا اور پان پیش کرنے والا آدمی ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ آخرکار مرزا صاحب نے خاصدان ملازم کے ہاتھ سے لیکر اس میں سے دو پان نکالے اور نوکر کے دونوں ہاتھ میں دیدیئے اور حکم دیا کہ دونوں صاحبان کے درمیان میں کھڑے ہو جاؤ اور ایک وقت میں دونوں کو پان دے دو۔ جھگڑا اس پر لطف فیصلے پر ختم ہوا۔

۲۵ر اگست ۱۸۹۶ء

آج مرزا صاحب بولے کہ بچپن میں میرے کئی بار چیچک نکل چکی ہے مگر خدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ چیچک کا داغ میرے جسم پر کہیں نہیں ہے، اس کمی کو میرا تخلص "داغ" رکھ کر پورا کر دیا گیا ہے۔ چیچک نکلنے سے جسم دغیلا تو نہیں ہوا لیکن رنگ کالا ہو گیا۔

مرزا صاحب گو خوب صورت انسانوں میں نہیں ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے انہوں نے کچھ ایسے جاذبِ نظر خدوخال پائے ہیں کہ آدمی ان کی وجاہت سے متاثر و مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتا، دراز قد، بدن مائل بہ فربہی۔ ڈاڑھی چھوٹی اور چڑھی ہوئی، خضاب ہر دوسرے اور تیسرے لگتا ہے، ڈھاکے کے کپڑے خصوصاً ململ بہت پہنتے ہیں، مرزا صاحب کا انگرکھا پیرس دھے کی بہ نسبت کچھ بڑا ہے، ہمیشہ تنگ موری کا پاجامہ پہنتے ہیں۔

۲۸/اگست ۱۸۹۸ء

آج حسب معمول محمد ابراہیم خاں[۱] ساماں تشریف لائے، مرزا صاحب بیٹھے ہوئے ان جانوروں کا تماشا دیکھ رہے تھے جو ان کے گھر میں پلے ہوئے ہیں، محمد ابراہیم خاں اور مرزا صاحب کی عمر قریب قریب ایک ہے اکثر آپس میں محض اس ہم عمری کی وجہ سے مذاق بھی ہوتا ہے، مرزا صاحب کو اس رنگ میں دیکھ کر خاں ساماں صاحب نے فرمایا کہ آپ کا یہ چڑیا خانہ مکمل نہیں ہے۔ مرزا صاحب بولے بھائی یہ بچوں کا شوق ہے، لاڈلی نے یہ سب پال رکھے ہیں ورنہ داغ کو چوہوں، بلیوں، کبوتروں، طوطوں، بٹیروں، لوؤں، تیتروں اور مرغیوں سے کیا کام میں اکثر لاڈلی سے کہا کرتا ہوں کہ بٹی سور پالنا اور رہ گیا ہے کہو تو ایک سور اور منگوا دوں ——— اور غالباً اسی کمی کو محسوس کر کے آپ اس چڑیا خانے

۱؎ محمد ابراہیم صاحب خانساماں میر محبوب علی خاں نظام دکن کے خانساماں تھے حیدرآباد کے رہنے والے اور پڑھے لکھے آدمی تھے، شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، نظام دکن کے بہت معتمد علیہ تھے داغ کو حیدرآباد آنے کی دعوت انہوں نے ہی دی تھی، داغ کے بڑے قدر دان تھے، حسن علی خاں امیر اور غلام قادر گرامی کے خاص احباب میں سے تھے، مرزا داغ کی کامیابی اور عروج کی وجہ یہی خانساماں تھے، داغ کی وفات کے بعد عرصے تک زندہ رہے، انکے ایک فرزند کریم الدین صاحب محکمۂ فنانس میں منتظم تھے اور حضرت داغ سے انہیں فیض تلمذ تھا۔ انکے پوتے ظہیر الدین ایم اے اب بھی عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازم ہیں، اور علم و ادب کا بڑا اچھا مذاق ہے، محمود گاواں پر انہوں نے ایک مقالہ لکھکر چھپوایا ہے، بعض اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۳؎ لاڈلی بیگم مرزا داغ کے خاندان کی ہی ایک لڑکی تھیں، چونکہ مرزا صاحب (باقی صفحہ ۳۰)

کو نامکمل بتاتے ہیں، خاں ساماں صاحب مرزا صاحب کے اس فقرے پر دیر تک ہنستے رہے ۔

باتوں باتوں میں آج دلّی کا ذکر نکل آیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ دلّی جو کبھی جنت تھی اب جہنم ہے، جن آنکھوں نے دلّی کی بادشاہت دیکھی ہو، دلّی میں من برستے دیکھا ہو، جن کانوں میں نوبت خانے کی آوازیں گونج رہی ہوں وہ موجودہ دلّی اور اس کی حالت پر نظر کر کے اسے جہنم نہ کہیں تو کیا کہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اب میں اپنے کو دکنی کہنے لگا ہوں۔ دکن ہی اب دوسرا وطن ہے اور دکن کی سرزمین میں ہی میری قبر کی بنا ہے یہ فرما کر بڑی دیر تک دردناک آواز میں یہ اشعار پڑھتے رہے

(بقیہ صفحہ ۲۹) صاحب اولاد نہیں تھے اس لئے انکی اہلیہ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا اور بمنزلہ اولاد صلبی سمجھا کرتے تھے۔ لاڈلی بیگم سراج الدین احمد خاں سائل کے بڑے بھائی کے عقد میں تھیں، ان سے ناصر الدین نامی ایک لڑکا ہوا۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد لاڈلی بیگم حیدرآباد آگئیں اور مرزا صاحب نے سائل صاحب سے ان کا عقد کر دیا، سائل صاحب سے بھی لاڈلی بیگم صاحب اولاد ہوئیں، مرزا صاحب کی سفارش سے لاڈلی بیگم اور انکے لڑکے ناصر الدین کا بھی ریاست سے وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو داغ کی وفات کے بعد تک جاری رہا، ناصر الدین مذکور کی مرزا صاحب نے بڑی شان سے پرورش کی تھی مگر ان میں بعض عیوب ایسے پیدا ہو گئے کہ جنکی بنا پر انکی پنشن بند ہو گئی، وہ مع اہل کے دہلی چلے گئے، ۱۹۴۸ء میں پھر حیدرآباد پہنچے اور وظیفے کے اجراء کیلئے کوشاں ہوئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی، کچھ روز حیدرآباد رہے مگر پولیس ایکشن کے بعد کراچی چلے گئے

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی — تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لوٹ کے سب شوکت و شانِ دہلی — پوربی پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی
دلی والوں کے لئے تازہ بنیگی جنت — لے گئے سر پہ ملک تحفۂ مکانِ دہلی
رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش رفتار — سروِ آزاد تھا ہر ایک جوانِ دہلی
عارضِ صاف تھا ہر ایک مصفا بازار — چشم پر جلوہ تھی ایک ایک دکانِ دہلی
گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب — گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہ ہو طولِ حساب — بس یہی ہو گا کہ ہم اور بیانِ دہلی
دے دیا فوج کو انعام میں حکام نے سب — گنج قاروں سے فزوں گنج نہانِ دہلی
یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند — کعبہ والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی
آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے — کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

نیر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

۲ر ستمبر ۱۸۹۸ء

آج کی صحبت میں بہت دیر تک مرزا صاحب "عشق صادق" پر روشنی ڈالتے رہے اور بتاتے رہے کہ عشق صادق میں انسان تن بدن کا ہوش کھو دیتا ہے، دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ قوتِ امتیاز باقی نہیں رہتی اور انسان اپنی ہستی و شخصیت کو محو کر بیٹھتا ہے۔ مرزا صاحب نے عجیب عجیب انداز سے عشق حقیقی و مجازی کے فرق و امتیاز میں دلائل پیش فرمائے اور اسی سلسلے میں ایک عجیب افسوسناک

واقعہ بھی سنایا،

انہوں نے فرمایا کہ میں کلکتہ میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا[1]، مکان کی کھڑکی سے بازار کی سیر کر رہا تھا، رات کے ۸ یا ۹ بجے یکایک میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی، غور کیا تو ایک شخص میرا ہی ایک شعر نہایت دردناک آواز سے گاتا ہوا چلا آ رہا تھا، شعر یہ تھا ؎

دنیا میں کوئی لطف کرے یا جفا کرے
جب میں نہیں بلا سے مری کچھ ہوا کرے

گانے والے کی دردناک آواز اور پھر میرا ہی شعر، میں اس درجہ متاثر ہوا کہ بے اختیار گانے والے کو آواز دی اور اشارہ کیا، پہلے تو حیران ہو کر اس نے مجھے دیکھا لیکن میرے دوسرے اشارے پر وہ میرے پاس چلا آیا۔ ۲۰ یا ۲۲ برس کا نہایت خوبرو لڑکا تھا، نام پوچھا تو احمد بتایا، میں نے پوچھا کس کا شعر پڑھتے ہوئے جا رہے ہو اس نے کہا داغ کا، میں نے پوچھا داغ کو تم نے دیکھا بھی ہے، کہا نہیں، میں نے کہا تم داغ کو دیکھنا بھی چاہتے ہو اس نے کہا آج سے پہلے تو ضرور داغ کو دیکھنے کی تمنا تھی، لیکن اب تو صرف ایک تمنا ہے، میں نے پوچھا وہ کیا، لڑکا میرے اس سوال پر کچھ گھبرا سا گیا۔ جب بہت اصرار کیا تو کہا کہ اگر آپ مجھے "صغیرہ" کو دکھا دیں تو تمام عمر آپ کا احسان نہ بھولوں، یہ سن کر مجھے

---

[1] کلکتہ میں مرزا داغ کا قیام ناخدا کی مسجد کے سامنے ایک بالاخانے پر تھا جو مخصوص انکے لئے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ اور منی بائی حجاب کے مکان سے قریب واقع تھا۔

تعجب ہوا، پوچھا یہ صفیہ کون ہے اس نے بتایا کہ یہ صفیہ وہ ہے جس پر میں ۴ سال سے فریفتہ تھا اور امید تھی کہ کسی نہ کسی روز اسے اپنالوں گا لیکن آج وہ خیال بھی خام ہوگیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ کل اس کی شادی ہوگئی، میرا اب زندہ رہنا بیکار ہے، یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جانے لگا، میں نے اسے روک کر کچھ اور حال دریافت کرنا چاہا لیکن وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر یہ کہتا ہوا کہ چھوڑئے مجھے صفیہ کے پاس پہونچنے میں دیر ہوتی ہے، چل دیا اور پھر نہایت دردناک آواز گانے کی میرے کانوں میں آنے لگی، عشقِ حقیقی کی اس سچی مثال نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، یہ واقعہ بیان کرکے مرزا صاحب خاموش ہوگئے ان کے چہرے پر افسردگی و غم کے آثار نظر آنے لگے میں نے مرزا صاحب کے دل و دماغ سے یہ اثر ختم کرنے کیلئے کہا کہ اس واقعہ سے آپ کے کلام کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مرزا صاحب بولے کہ ایسی مقبولیت کس کام کی کہ میرے ایک شعر نے ایک نوعمر و نوجوان کی زندگی کا فیصلہ کردیا، اور نہیں معلوم اس بے چارے نے کنوئیں میں گر کر جان دی یا دریا میں ڈوب کر زندگی کا فیصلہ کیا، مجھے جس وقت اس کی جوانی یاد آتی ہے بڑی اذیت ہوتی ہے۔

صبح کی نشست میں مرزا صاحب بولے کہ آج میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے حاضرین میں سے بارق صاحب نے پوچھا کہ جب ایسا ہوتا ہے تو کیا ظہور میں آتا ہے بولے اگر میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو خوشی اور اگر دائیں تو رنج ہوتا ہے

میں نے عرض کیا کہ حضرت آثار اچھے ہیں، آپ کی بائیں آنکھ پھڑک رہی کچھ بہتر ہی ہوگا۔ یہ واقعہ صبح کا تھا، شام کو جب میں حسب معمول پہنچا تو مرزا صاحب بولے کہ دیکھو سید ہم نہ کہتے تھے کہ ہماری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے، کوئی خوشی ہوگی آج کی ڈاک میں منی بائی[1] کا خط آیا ہے پورے ایک ماہ کے بعد یاد آیا ہوں تو تم بھی پڑھ لو جواب کل صبح لکھا جائے گا۔ میں نے خط پڑھا، مضمون یہ تھا:۔

حاجی صاحب! تسلیم

آپ کہتے ہوں گے منی مر گئی یا پیمان بھول گئی، یہ سب کچھ نہیں

---

[1] منی بائی کلکتہ کی ایک ڈیرہ دار طوائف تھیں، پڑھی لکھی اور صاحب جمال تھیں شاعری سے بھی لگاؤ تھا اور حجاب تخلص کرتی تھیں۔ رام پور کے میلۂ بے نظیر میں پہلی بار حضرت داغ سے ملاقات ہوئی، تعلقات بڑھے اور مرزا صاحب کلکتہ کی اس پری جمال کو دل دے بیٹھے۔ منی بائی دوسری بار بھی رام پور پہنچیں اور داغ کی مہمان رہیں، تعلقات اتنے بڑھے کہ مرزا صاحب بی حجاب سے ملاقات کیلئے خود کلکتہ پہنچے، اور کچھ عرصے وہاں رہ کر داد عیش دی، کلکتہ سے واپس ہوئے، تو منی بائی حجاب کی محبت پوری طرح مرزا داغ پر مسلط ہو چکی تھی جس کی یادگار ان کی مشہور مثنوی "فریاد داغ" ہے جو بکر حجاب کے عشق اور سوز محبت کی رنگین و دلچسپ داستان ہے۔ حجاب حیدرآباد پہنچیں اور کئی سال تک مرزا صاحب کے پاس رہیں۔

منی بائی حجاب کا جستہ جستہ ذکر خود اس روزنامچہ میں کیا گیا ہے جس سے ان کے بہت سے حالات واضح ہو جاتے ہیں۔

نہ مری ہوں نہ آپ کو بھول سکتی ہوں۔ ایک عشرے سے کچھ زائد ہوا بہن[1] یکایک بیمار ہو گئی، معمولی بخار تھا، اس نے سرسامی صورت اختیار کر لی سارا گھر پریشان تھا، میں اس کی تیمار داری میں لگی تھی، آج شیخ جی[2] نے آپ کا اشتیاق سے بھرا خط دیا، اسی وقت یہ چند جملے لکھ کر روانہ کرتی ہوں۔ آپ مطلق وہم دل میں نہ لائیں، ذرا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بیمار کا حال اب بہتر ہے حکیم صاحب[3] کی خاص توجہ ہے، آپ کا خط آتے آتے وہ یقیناً چنگی ہو جائے گی۔

راقم منی از کلکتہ ۲۳ / اگست ۱۸۹۶ء

---

[1] حمیدن بائی سے مراد ہے یہ حجاب کی چھوٹی بہن تھی، یہ بھی شاعری کرتی تھی نقاب تخلص تھا، اور بڑی بہن حجاب ہی سے مشورہ کرتی تھی، نمونہ کلام میں دو چار شعر سنئے:

میرے بجائے اس نے عدو کو بٹھا لیا ؛ یہ داغِ رشک مجھ سے اٹھایا نہ جائیگا

وہ اور وصلِ غیر یہ امر محال ہے ؛ تسکین دے رہا ہے مجھے یار کا حجاب

دور سب سے بزمِ جاناں میں مَیں بیٹھا رہ گیا ؛ یہ نہ بولا ہائے کوئی ایک پیمانہ اسے

[2] شیخ محمد وزیر سے مراد ہے، عظیم آباد کے رہنے والے تھے، کلکتہ جا رہے تھے، پڑھے لکھے آدمی تھے ایک پرچہ موسومہ "گلدستۂ سخن" نکالتے تھے، دو اور دو اخبار یعنی "گوہر آصفی" اور "جنرل" بھی انہیں کی ادارت میں نکلتے تھے، بڑے اچھے شاعر تھے۔ حجاب کے حاشیہ نشین اور مرزا داغ کے مخلصین میں سے تھے۔

[3] ان کا نام داد اللہ بخش تھا، طبابت پیشہ کرتے تھے، حجاب کے حاشیہ نشینوں میں ان کا خاص رتبہ تھا۔ مرزا داغ سے قیام کلکتہ کے دوران تعلقات بڑھے۔

خط پڑھ کر میں نے کہا کہ حضرت اس خط میں تو کوئی خوشی کی بات نہیں ہے بلکہ آپ کی بائیں آنکھ کا پھڑکنا تو خبرِ بد کے ملنے کی پیشین گوئی ہے، میرے اس کہنے پر مرزا صاحب ہنسے اور بولے کہ میاں یہ سب بد اعتقادیاں ہیں نہ آنکھ پھڑکنے سے خوشی ہوتی ہے اور نہ رنج یہ سب انسان کے توہمات ہیں

۸ ستمبر ۱۸۹۸ء

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرٹھ کی ایک پرائیوٹ نشست میں ایک طوائف نے مجھے ایک مصرع دیا اور فرمائش کی کہ اس پر اگر آپ فی البدیہہ غزل فرمادیں تو چار مجرے آپ کو مفت سناؤں، مرزا صاحب نے اسی جلسے میں بیٹھے بیٹھے چند منٹ میں غزل کہدی جس کا مقطع یہ ہے ؎

مئے و معشوق سے توبہ کرے گا داغ تو توبہ
تری نیت تو اے مرد خدا اچھی اور کہتی ہے

مرزا صاحب کے یہاں ایک ماما نوکر ہے جس کا نام "لالا بی"[1] ہے، حیدر آباد کی رہنے والی ہے، آج بولی کہ میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتی، وجہ دریافت ہوئی تو اس نے بتایا کہ آپ کے یہاں میری زبان خراب ہوتی ہے، مجھے حیدر آباد کے مقابلے میں دلّی کی زبان اچھی نہیں معلوم ہوتی، یہ سن کر ہم سب

---

[1] دکن میں "لال بی" اکثر نام ہوتا ہے، لیکن اصل مسودے میں مجھے یوں ہی لکھا ملا ممکن ہے کہ "لال بی" کو اس طرح نام بدل کر لالا بی پکارنا پسند نہ آیا ہو اور اسی وجہ وہ خفا ہو گئی ہو

کو بڑی حیرت ہوئی، مرزا صاحب ہنسکر بولے، دیکھئے لوگوں کو اپنی زبان کتنی پیاری ہوتی ہے، دلی کی زبان کا تمام ہندوستان میں چرچا ہے اور سند مانی جاتی ہے، لیکن اس عورت کو اپنی زبان پر ناز ہے، میں اسی مغالطہ میں تھا کہ حیدرآباد رہ کر میری زبان خراب ہو رہی ہے آج معلوم ہوا کہ یہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دلی والوں کی زبان کو پسند نہیں کرتے، اس ماما کو لاکھ سمجھایا لیکن وہ نوکری چھوڑ کر چلی گئی۔

آج میں مرزا صاحب سے اپنی ایک غزل پر اصلاح لے رہا تھا، دو تین شخص بیٹھے تھے، منجملہ ان کے صاحب جان بھی موجود تھیں جو مرزا صاحب کی ملازم ہیں، میں نے جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

کسی دن جا پڑے تھے بے خودی میں انکے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلے میرے پتھر سے

شعر سن کر مرزا صاحب نے سکوت فرمایا، صاحب جان بڑی حاضر جواب اور صحبت یافتہ طوائف تھی میرا شعر سن کر بولی کہ احسن صاحب بے خودی میں بھی دونوں ہاتھوں سے کام لیتے ہیں، مرزا صاحب مسکرائے اور بولے میاں احسن تمہارے شعر پر صاحب جان نے اصلاح دیدی اور برجستہ میرے اس شعر کو یوں درست فرما دیا ؎

کسی دن جا پڑا تھا بے خودی میں انکے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلا میرا پتھر سے

اصلاح کے بعد میں سمجھا کہ صاحب جان کے اس فقرے کا کیا مطلب تھا۔

آج مرزا صاحب نے بر سرِ تذکرہ فرمایا کہ میں نے مرزا غالب[1] کی مشہور غزل

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پر غزل کہہ کر جب انہیں سنائی تو بڑی تعریف کی، بعض بعض اشعار پر تو مجھے گلے سے لگا لیا، میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا

دلبروں پر طبیعت آتی ہے
اس طرح اس قدر نہیں آتی

تو یہ شعر حضرتِ غالب نے کئی دفعہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا، اس کے بعد جب میں اس شعر پر پہونچا

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور
یہ تجھے مفت بر نہیں آتی

تو غالب بے چین ہو گئے، زانو پر ہاتھ مار کر بولے خدا نظرِ بد سے بچائے صاحبزادے تم نے تو کمال کر دیا میری غزل کے اس شعر پر

حال معلوم ہے قیامت کا
بات کہنے میں پر نہیں آتی

---

[1] مرزا غالب کی بیوی حضرت داغ کے والد نواب شمس الدین خاں کی حقیقی چچازاد بہن تھیں جن کے والد کا نام نواب خواجہ الٰہی بخش خاں تھا، معروف تخلص کرتے تھے، نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے، اس رشتے سے غالب مرزا داغ کے پھوپھا ہوئے۔

مرزا غالب کھڑے ہو گئے، مجھے سینے سے لگالیا، دیر تک کھڑے کھڑے جھومتے رہے اور میرے شعر کو دہراتے رہے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے روز حضرت غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں، شطرنج بھی ہوتی تھی میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانے میں اپنی غزل سناؤ، ایک دفعہ میں شطرنج کی بازی ہارا حسب معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ، میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین "ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے" میں جو غزل تم نے کہی ہے وہ سناؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ میرے اس شعر پر ؎

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی
اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیئے

مرزا غالب بولے، میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے اور پھر اپنا شعر پڑھا

؎ ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے

شعر سن کر مرزا غالب اف کہہ کے رہ گئے۔ میں نے فوراً یہ دوسرا شعر پڑھا،

؎ گو تری نظروں سے گر ہی پڑے ہیں
آج تو کوئی ٹھکانا چاہیئے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے، بولے ٹھہرو، زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے، میری گرد چار پانچ بار گھومے، گھومنے کی حالت میں نہایت دردناک آواز میں میرا یہ شعر پڑھتے جاتے تھے

آج شام کو ایک کتب فروش صاحب "مثنوی یوسف وزلیخا" کا فارسی قلمی نسخہ لے کر بغرض فروخت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مثنوی نہایت خوش خط، مطلا حاشیوں اور نہایت دلکش رنگین تصاویر کی حامل تھی مرزا صاحب دیر تک مثنوی کی ورق گردانی کرتے رہے، کئی جگہ سے اسے پڑھا ایک تصویر پر پہونچے تو اسے دیر تک دیکھتے رہے، تصویر میں سین تھا کہ حضرت یوسف جارہے ہیں اور زلیخا ان کا دامن تھام کر ان کو روک رہی ہیں، دوسرا ہاتھ زلیخا کا دل پر رکھا ہوا ہے، اس تصویر کو دیکھ کر مرزا صاحب ہنسے اور اپنا یہ شعر فرمایا ؎

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے
دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

مثنوی کی قیمت پوچھی، تو کتب فروش نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے، مرزا صاحب بولے بھائی مثنوی تمہاری بیش بہا ہے لیکن جس سے تم بھاؤ کر رہے ہو وہ غریب آدمی ہے۔ الغرض ۵۰ روپیہ پر معاملہ طے ہوا اور کتاب لے لی گئی۔

۱۰ر ستمبر ۱۸۹۶ء

آج میں حسبِ معمول شاگردوں کی غزلیں مرزا صاحب کو سنا سنا کر اصلاح لے رہا تھا مرزا صاحب کے ایک شاگرد محمد نوح[1] ہیں، نارہ ضلع الہ آباد ان کا وطن ہے، ان کی دو غزلیں اصلاح کے لیئے آئی تھیں، ایک غزل چھوٹی بحر میں تھی جس کا مطلع تھا ؎

حالِ دل کو گلا سمجھتے ہیں
کیا میں کہتا ہوں کیا سمجھتے ہیں

میں نے مطلع پڑھا، سن کر بولے آگے پڑھو، میں نے دوسرا مطلع پڑھا ؎

سب خدا جانے کیا سمجھتے ہیں
ہم بتوں کو خدا سمجھتے ہیں

اس مطلع کو سن کر مرزا صاحب بولے اس کے حاشیہ پر لکھدو:۔

"دیکھو تم ایک شعر میں کافر ہو گئے، مرتد ہو گئے اور مشرک ہو گئے"۔

---

[1] محمد نوح نام اور نوح تخلص ہے، قصبہ نارہ ضلع الہ آباد کے متمول لوگوں میں شمار رہے داغ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں، کچھ عرصے استاد کی خدمت میں حاضر بھی رہے ہیں داغ کے کثیر التعداد تلامذہ میں جو معدودے چند تلامذہ حیات ہیں ان میں ایک ذات نوح صاحب کی بھی ہے، ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں، اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، مرزا داغ کی قائم کی ہوئی ڈگر پر قائم ہیں

آج کی ڈاک میں مرزا صاحب کے نام دلی سے کسی ہندو صاحب مطبع نے قرآن شریف کی دو جلدیں بھیجیں اور خط میں لکھا کہ ایک آپ کی خدمت میں ارسال ہے اور دوسری جلد اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی خدمت میں میری طرف سے پیش کر دیجئے، مرزا صاحب نے اسی وقت وہ دونوں جلدیں قرآن پاک کی صاحب مطبع کو واپس کروائیں اور ان کے خط کی پشت پر لکھوایا کہ :-

"کیوں صاحب ایک قرآن شریف مجھے رشوت میں روانہ کیا ہے میں ہرگز آپ کا بھیجا ہوا قرآن شریف اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا"

آج شام کو ڈاکٹر سید احمد علی صاحب ملاقات کو تشریف لائے، یہ حیدرآباد کی فوج میں ڈاکٹر کی حیثیت سے متعین ہیں، اسی جلسے میں چند منٹ کے بعد مرزا صاحب نے ڈاکٹر موصوف سے میرا تعارف کرایا، تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ مارہرہ شریف کے سادات سے ہیں، بڑے لائق ہیں یہ ہیں اور وہ ہیں، آخر میں بولے کہ ڈاکٹر صاحب اگر آپ مرشد ہیں[1] تو یہ پیر مرشد ہیں :-

---

آج شطرنج کے کھیل کا ذکر کرتے ہوئے مرزا صاحب نے فرمایا کہ جوانی میں ہماری شطرنج بازی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ہم غائبانہ شطرنج کھیلا کرتے تھے، میں نے پوچھا کہ غائبانہ کھیل حضرت کیسا ہوتا ہے، بولے کہ ایک حریف کی پیٹھ

---

[1] ان کا مفصل حال صفحہ ۹۹ پر ملاحظہ کیجئے۔

کے پیچھے شطرنج کی بساط بچھا کر مہرے رکھدیتے ہیں جب دوسرا حریف مہرے چلتا ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے کہ فلاں مہرہ فلاں خانے سے فلاں خانے میں چلا گیا ہے پس وہ اپنے خیال سے بتا دیتا ہے کہ میرے فلاں مہرے کو فلاں جگہ رکھدو، غرض اس طرح خانوں کے نمبر مقرر کرکے اور مہروں کی چالیں ذہن نشین کرکے شطرنج کھیلا جاتا ہے، اہل فارس اس کھیل کو "غائبانہ" کہتے ہیں اور ہم اس کو "غائب شطرنج" کا نام دے سکتے ہیں، مرزا صاحب نے فرمایا کہ شطرنج کھیلنے کے شوقین لوگوں نے سینکڑوں طریقے ایجاد کئے ہیں لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ دلچسپ، سب سے زیادہ دیدہ زیب اور سب سے زیادہ روح پرور کھیل وہ ہے جو شاہی حلقوں میں زندہ مہروں سے کھیلا جاتا تھا۔ خوبصورت مرد اور عورتیں مہرے ہوا کرتے تھے ایک بڑے کمرے میں شطرنج کی بساط بنی ہوئی تھی، بساط کے ہر دو طرف بیٹھنے کی نشستیں ہوتی تھیں، ان دونوں طرف کی نشستوں کے بیچ میں کھیلنے والوں کی نشست مقرر ہوتی تھی، پیدل عام طور سے خوبصورت خواصیں ہوتیں جو بہت خوبصورت اور موزوں لباس پہنے ہوتیں، پیدل کے علاوہ دوسرے مہرے اپنے ناموں کی مناسبت سے خوبصورت لباس پہنے ہوتے، مختلف ناموں کے ساتھ یہ مہرے بساط پر جا کھڑے ہوتے اور کھیل والے نام لے کر مہروں کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں منتقل ہونے کا اشارہ کرتے اور یہ مہرے عجیب انداز دلربایانہ سے چھما چھم کرتے ہوئے ایک خانے سے دوسرے خانے میں جا کھڑے ہوتے، کوئی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوتا، کوئی صرف ایک ہاتھ نہایت دلفریب انداز سے

کمر پر رکھے ہوتا الغرض ہر مہرہ ایک مختص وضع اور انداز سے بساط پر کھڑا ہوتا اور کھیلنے والے کے اشارے پر حرکت کرتا، پیدل سب ایک انداز پر رہتے، یہ مہرے دو رنگوں کے لباسوں میں ہوتے لیکن رنگ کے علاوہ وضع قطع سوائے پیدل مہروں کے سب کی مختلف و منفرد ہوتی شطرنج کھیلنے کا یہ طریقہ بڑا دل بہلاؤ اور فرحت بخش ہوا کرتا تھا۔

اس کھیل کا آغاز جہانگیر کے زمانہ میں ہوا، اسے اس کھیل سے بہت لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کھیل کے لئے عام طور سے رات کا وقت مخصوص تھا جس مقام پر کھیل ہوتا وہ مختلف رنگ کے فانوسوں سے آراستہ ہوتا، ان فانوسوں سے نکلنے والی تیز روشنی اس مقام کو بقعۂ نور بنا دیتی تھی، خوبصورت اور حسین و جمیل کنیزیں جس وقت مختلف رنگ کے لباس پہن کر ایک ادائے مستانہ سے بساطِ شطرنج پر جلوہ گر ہوتیں تو اندر کے اکھاڑے کا تخیل بپا معلوم ہونے لگتا۔ جن لوگوں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا وہ لوگ واقعی بڑے خوش قسمت ہوں گے۔ اتنے عرصے کے بعد اس نوع کی شطرنج بازی کا ذکر ہی سن کر ہم حیران ہو جاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ ہمارے بزرگ کتنے خوش حال و خوش باش تھے کہ انکی تفریح اور دلگی کے لئے بھی کیسے کیسے سامان مہیا تھے،

اسی قسم کے ایک کھیل کے موقع پر جہانگیر کی ایک کنیز دل آرام نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

شاہا! دو رخ بدہ تو دل آرام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کن اسپ کشت مات

حفظ مراتب اور دوسروں کے اعزازِ نسبی و خاندانی کا مرزا صاحب بجد لحاظ رکھتے تھے، کسی حالت میں کسی بے تکلف سے بے تکلف کے ساتھ بھی وہ عمل پسند نہیں کرتے تھے جنکو رسماً خلافِ اخلاق کہا جاتا ہے، آج درد نقرس اور وجع المفاصل کی تکلیف سے بے چین تھے، دونوں پاؤں پر دواؤں کا ضماد لگا ہوا تھا، بے چینی کی وجہ سے سکون نہ تھا، کبھی پاؤں اٹھا لیتے کبھی پھیلا دیتے، اسی حالت میں کچھ حصہ پٹیوں کا ایک طرف سرک گیا میں پاس ہی پلنگ کی پٹی کے سہارے بیٹھا تھا، ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر پٹیوں کو درست کرنے لگا، یکایک ایک ہیچ مار کر اٹھ بیٹھے اور خفا ہونے لگے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں پرنم تھیں، بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ سید یہ کیا غضب کر رہا ہے میرے ناپاک پاؤں اس قابل کہاں کہ ایک سید زادہ کے ہاتھ اس پر پڑیں، للّٰہ معاف کرو اور آئندہ ایسی حرکت کا ارادہ بھی نہ کرنا۔ اس کے بعد لیٹ گئے اور اسی حالت میں ایک غزل تصنیف کی جس کے مطلعے یہ ہیں :-

گرچہ بحرِ عشق اک ذخّار ہے ڈوبنے والے کا بیڑا پار ہے

میں اگر عاصی ہوں وہ غفار ہے حق تعالےٰ کی بڑی سرکار ہے

---

۱۱ اکتوبر ۱۸۹۶ء

آج "بزم داغ" کے قریب قریب سب نورتن جمع تھے، میں تھا، عبدالحمید صاحب آزاد تھے، میر حسن علی خاں امیر[1] اور بارق[2]، مستجاب خاں خلق[3] اور سراج الدین احمد خاں سائل[4] تھے جلیل[5] و اختر[6] تھے اور آغا مظفر بیگ وغیرہ

---

[1] [2] [3] [4] [5] [6]، حواشی صفحہ ۲۶۴ پر دیکھیے

وغیرہ، موضوع بحث، ذوق مومن اور غالب وغیرہ اساتذہ تھے، کوئی غالب کو سراہ رہا تھا تو کوئی مومن کو، کوئی ذوق کے گن گا رہا تھا تو کوئی کسی دوسرے

لہ سائل صاحب کے والد کا نام شہاب الدین احمد خاں تھا جو نواب ضیاء الدین خاں جاگیردار ریاست لوہارو کے بھائی تھے۔ سائل ۱۸۶۴ء ۱۲۸۱ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، پہلی شادی نواب ممتاز حسین خاں رئیس پاٹودی کی بہن سے ہوئی تھی چند سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، ۴۴ سال کی عمر میں لاڈلی بیگم سے جو ان کے بڑے بھائی کی بیوہ اور داغ کی منہ بولی بیٹی تھیں عقد ہو گیا، جن سے صاحبِ اولاد ہوئے، سائل کے ان بڑے بھائی کا نام ممتاز الدین احمد خاں تھا، ان سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا کہ انتقال ہو گیا اور لاڈلی بیگم بیوہ ہو گئیں، لاڈلی بیگم مرزا داغ کی سالی کی لڑکی تھیں جن کو انہوں نے گود لے لیا تھا۔

لہ جلیل حسن نام اور جلیل تخلص تھا، فصاحت جنگ حیدرآباد سے خطاب عطا ہوا تھا، امیر مینائی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے اور انکی جانشینی کے دعویدار تھے، شروع میں مہاراجہ کشن پرشاد کے وابستگان میں رہے پھر عثمان علی خاں نظام دکن کے زمانہ میں ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔

سہ لطیف احمد نام تھا اور اختر تخلص، حضرت امیر مینائی کے صاحبزادہ تھے میر محبوب علی خاں کے زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد کے متوسلین میں رہے نواب عثمان علی خاں نے اپنے زمانے میں قدردانی فرما کر امور مذہبی کا معتمد مقرر کر دیا اور اختر نواز جنگ خطاب مرحمت ہوا، عرصے تک اسی خدمت پر مامور رہے جولائی ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

سکہ آغا مظفر بیگ نام تھا، داغ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے، اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

قدیم شاعر کے لئے خوش خیال تھا۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو حضرت ذوق کو سب پر فوقیت دے رہے تھے، جب ہر شخص رائے زنی کر چکا اور بحث کسی نتیجے پر نہ پہونچی تو لوگ مرزا صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس باب میں ان کی ذاتی رائے کے طلبگار ہوئے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ مومن شاعر تو باکمال تھے لیکن ان میں رعونت بہت تھی وہ کسی کا شعر پسند ہی نہیں کرتے تھے، رہے استاذ ذوق وہ پورے منصف تھے، مرزا غالب میں رواداری تھی لیکن وہ بھی آدھے منصف تھے اور بقدر ضرورت داد کمال دیتے تھے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ میری نظر میں صرف ایک شاعر ایسا تھا جو پورا منصف تھا اور اس سے ہر شخص کا حق داد حاصل کر لیا کرتا تھا اور وہ تھے جناب اسیر[1]۔ مرزا صاحب کی اس بے لاگ رائے زنی سے سب متفق ہو گئے۔

آج کی ڈاک میں کسی صاحب نے جو مرزا صاحب کے بے تکلف دوست ہیں[2] بحر لکھنوی[3] کی ایک غزل (ریختہ) مرزا صاحب کو بھیجی اور اس کی داد چاہی، مرزا صاحب

---

[1] اسیر کا مفصل حال صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمایئے

[2] یہ بے تکلف دوست بہادر حسین خاں انجم ہی ہو سکتے ہیں۔

[3] شیخ امداد علی نام اور بحر تخلص تھا، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، دربار رامپور سے عرصے تک وابستہ رہے، ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے ۱۸۷۸ء میں وفات پائی، بحر کی جو غزل مرزا صاحب کو بھیجی گئی تھی یہ ان کی بہت پرانی غزل ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے نہیں معلوم کہ بحر کے انتقال کے ۲۰ سال بعد یہ غزل کس لئے بھیجی گئی تھی، اصل مسودے میں اسکی کوئی صراحت نہیں ہے۔

نے دو دفعہ اس غزل کو پڑھوا کر سنا۔ اس غزل کے شعر یہ ہیں :-

آسیا سی ہیں چکنیاں اور پتھر چھاتیاں
مونگ چھاتی پر دلیں گی وہ ستمگر چھاتیاں

حسنِ روز افزوں نے گنجائش نہ پائی جسم میں
بن گیا انگیا کے پردے میں سمٹ کر چھاتیاں

نشۂ جوشِ جوانی یار کو ایسا چڑھے
توڑ کر بند اپنے جامہ سے ہوں باہر چھاتیاں

آسمانِ حسن اگر تجھ کو کہوں شایان ہے
مہر و مہ رخسار ہیں برجِ دو پیکر چھاتیاں

چاند سورج کی ہیں ٹکر سربلندی تا کجا
عرش کے قبے بنیں گی کیا ابھر کر چھاتیاں

تیغِ ابرو سے انہیں بھی خوف ہے میری طرح
رکھتی ہیں خود سایہ تا اپنے سر پہ چھاتیاں

دیکھنا کیا حسن کی دولت کا کوٹھا توڑ کر
نکلی ہیں سر پر لئے دو بدرۂ زر چھاتیاں

میرے ہاتھ آئیں تو محرم ہوں میں انکے جان سے
مرغ سیمیں بال ہیں یا بیضۂ زر چھاتیاں

آجکل ان کی خریداری ہے میٹھا مال ہے
بیچتی ہیں کوزۂ قند مکرر چھاتیاں

کیا کہوں اے تجر آب و تابِ اسکے جسم کی
پیٹ ہے کوثر حباب آب کوثر چھاتیاں

جب دو دفعہ غزل سن چکے تو مجھ سے بولے کہ اس غزل کی پشت پر لکھ دو کہ :۔

"آپ کی بھیجی ہوئی غزل پہنچی، مجھ سے زیادہ خوب اس کی تعریف آپ کی ماما ئیں کریں گی یہ جوڑے شیر تو آپ نے فرہاد کو بھیجی ہوتی، میرے لئے اتنی تکلیف کیوں گوارا کی، آپ کی بھیجی ہوئی غزل کا یہ شعر ؎

دیکھنا کیا حسن کی دولت کا کوٹھا توڑ کر
نکلی ہیں سر پہ لئے دو بدرۂ زر چھاتیاں

بہت خوب ہے، ایک ایک ہزار کی تھیلیوں کو اس خوبصورتی سے باندھا

ہے کہ زر بھرنے کی وجہ سے اس شعر کی چھاتیوں میں اعلیٰ درجے کی سختی آگئی ہے۔ میں تحجر کی اس ریختی کے بھیجنے کی وجہ نہ سمجھا، میں تو تجربے اس سے اونچی چیزیں سن چکا ہوں ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ رامپور میں منیر شکوہ آبادی[1] نے سرِ دربار میرا دامن تھام لیا اور مجھ سے سوال کیا کہ میں ان کو اس کی وجہ بتاؤں کہ میرے اشعار زبان سے نکلتے ہی زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں اور لوگ انہیں جھوم جھوم کر پڑھتے اور لطف اٹھاتے ہیں اور ان کے اشعار پر کہ وہ خونِ جگر ایک کر کے کہتے ہیں لوگ متوجہ بھی نہیں ہوتے اور پسندیدگی کی سند ہاتھ نہیں آتی اور یہ ایک میرا ہی نہیں بلکہ دوسرے ہمعصر شعراء کا بھی یہی حال ہے — منیر شکوہ آبادی

---

[1] منیر کا نام محمد اسمٰعیل تھا، منیر تخلص، شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے، سید احمد حسین صاحب شاد کے صاحبزادے تھے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی، ابتدا میں ناسخ سے اصلاح لی پھر میر اوسط علی رشک کو کلام دکھایا، مرثیہ گوئی میں دبیر سے مشورہ کرتے تھے، مرشد آباد، لکھنؤ، فرخ آباد اور باندہ وغیرہ میں رؤسا سے وابستہ رہے کسی قتل کے مقدمے میں بے گناہ ماخوذ ہوئے اور کالے پانی بھیج دیئے گئے، چند سال وہاں رہے جب بے قصور ثابت ہوئے رہا ہوئے اور نواب رام پور نے قدر افزائی کی، آخر وقت تک وہیں رہے۔ ان کا دیوان بنام "ثمرِ ہند" شائع ہو چکا ہے دنیائے شاعری کی مشہور شخصیت ہیں

کے اس سوال پر میں ابھی خاموش ہی تھا کہ امیر مینائی[1] بول اٹھے کہ یہ خداداد مقبولیت ہے اس پر کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔

یکم جنوری ۱۸۹۹ء

مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ مرزا نوشہ (غالب) شاہ ظفر کے حضور اپنی ایک غزل لے کر پہونچے، جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

---

[1] امیر احمد صاحب نام امیر تخلص تھا، مولوی کرم احمد صاحب کے صاحبزادے تھے، لکھنؤ وطن تھا، سلسلۂ نسب شاہ مینا تک پہونچتا تھا لہٰذا امیر مینائی کہلائے ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے، شاعری میں میر مظفر علی اسیر سے تلمذ تھا، عرصے تک واجد علی شاہ اودھ کے دربار سے وابستہ رہے، غدر کے بعد کچھ عرصے انگریزی حکومت کی نوکری کی، پھر ترک کردی، ریاست رام پور میں ملازم ہو گئے، اور والیٔ ریاست کے استاد بھی ہوئے، رام پور میں تقریباً ۴۳ سال رہے، رام پور میں علاوہ نواب کے جنرل عظیم الدین خاں آپ کے بڑے قدردان تھے، دنیائے شاعری کی بہت مشہور ہستی ہیں، آپ کے شاگردوں میں دو ایک بڑے نامی گرامی شاعر ہوئے ہیں، جن میں ریاض خیر آبادی جلیل مانکپوری پنڈت رتن ناتھ سرشار، دل شاہجہاں پوری وغیرہ سے آج کون واقف نہیں۔ آخر میں داغ نے امیر کو حیدرآباد بلالیا، مگر کچھ ہی روز کے بعد امیر نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

بادشاہ کو یہ زمین بہت پسند آئی، حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو، ہماری جوانی کا زمانہ تھا، طبیعت پورے جوش پر تھی، ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہونچے، جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی

کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلاکر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔

مرزا صاحب آئے دن دردِ نقرس کی تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں، آج پھر ان کو بہت تکلیف ہے، دونوں گھٹنوں پر سخت ورم آگیا ہے، تپ و لرزہ بھی شروع ہو گیا ہے، اٹھنا بیٹھنا بالکل ترک ہے، پاخانے پیشاب کے لئے پلنگ کے قریب چوکی لگادی گئی ہے، میں آج تمام دن حاضرِ خدمت رہا، شام کو خانساماں صاحب مزاج پرسی کو آئے اور کیفیت دریافت کی، مرزا صاحب نے ایک آہ کھینچی اور فرمایا ؎

جو گزرتی ہے ہم کہیں کس سے

تنگ آئے ہیں دردِ نقرس سے

اسی تکلیف کی حالت میں یکایک میری طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

صبح کو وہ زلفِ مشکیں کی مہک

اور وہ بو باس باسی ہار کی

میں نے اس شعر کی بہت تعریف کی، بولے تم کیا تعریف کرتے ہو۔ کبھی زلف کی

مہک اور ہار کی بو باس سونگھی ہو تو اس شعر کا لطف ہو۔

مرزا صاحب اس تکلیف میں بھی کبھی کبھی ایسی زندہ دلی کی باتیں کیا کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

آج مولوی محب حسین[1] اور ہم حاضر تھے، محب حسین نے پوچھا کہ حضرت لفظ "بل توڑ" ہے یا "بال توڑ" مرزا صاحب نے فرمایا کہ دونوں طرح بولتے ہیں لیکن "بال توڑ" فصیح ہے، یہ فرما کر مرزا صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری ——— ہم لوگ سمجھے کہ درد نقرس کی تکلیف کی وجہ سے ایسا کیا، میں نے پوچھا کہ کیا حضرت تکلیف زیادہ ہے بولے نہیں سید تکلیف تو جو ہے سو ہے اس وقت اہلیہ مرحومہ یاد آگئیں ان کے مرنے سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ ایک ہمراز و ہمدرد اٹھ گیا دوسرا نقصان یہ بھی ہوا کہ بعض دلی کے محاوروں کی تحقیق میں مجھے دقت ہوگی اکثر ایسا ہوا کرتا تھا کہ کوئی محاورہ محل بحث ہوا تو اس کی تصدیق مجھے مرحومہ سے ہو جایا کرتی تھی ایک دفعہ "باوشاہی" کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، کچھ کہتے تھے

---

[1] یو پی کے رہنے والے تھے، حیدرآباد آکر افسر جنگ کے پاس فوجی دفتر میں ملازم ہوئے افسر جنگ کی لڑکیوں کو پڑھاتے بھی تھے، بعد میں دفتر ملکی میں رہے پھر معتمدی سیاست (پولیٹیکل سکریٹریٹ) میں مترجم بھی ہو گئے بڑے قابل بزرگ تھے، شعر بھی کہتے تھے اور داغ کے شاگرد تھے، ان کی کتابوں میں امیر علی ٹھگ اور میرا ابلاجرم جو سر میڈوز ٹیلر کی کتابوں کے ترجمے ہیں بہت مشہور ہیں۔ حیدرآباد سے شفیق نسواں اور معلم النسواں نام سے دو رسالے نکالے ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا۔

مذکر ہے اور کچھ اسے مونث بتاتے تھے، بیوی سے جب دریافت کیا گیا تو ان کا فیصلہ تھا کہ بالو شاہی مونث ہے۔

مرزا صاحب نے بتایا کہ ریاست رام پور کا طریقہ تھا کہ ریاست کے ملازموں کو تنخواہ تو بہت کم ملا کرتی تھی لیکن خاطر و مدارات، دل دہی اور انعام و عنایات میں کمی نہیں ہوتی تھی، ہر ملازم کی گزر اوقات کا خاص ذریعہ انعامات وغیرہ ہی ہوتے تھے جو خاص خاص موقعوں پر یا کسی تقریب کے وقت یا کسی کارگزاری کے موقع پر انعام کی صورت میں عطا ہوتے تھے ہر ملازم سے علاوہ اس کے فرائضِ منصبی کے کوئی مصاحبانہ خدمت بھی ضرور لی جایا کرتی تھی، مرزا صاحب کے فرائضِ منصبی میں محکمات اصطبل و فراش خانہ کی نگرانی اور انتظام و انصرام تھا لیکن ان فرائض کی ادائیگی کے ساتھ انہیں شاعرانہ مصاحبت بھی کرنا پڑتی تھی، انہیں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں ۱۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، انعامات و عطیات اس کے علاوہ تھے، مرزا صاحب نے بتایا کہ اس زمانے میں اصطبل اس عمارت میں تھا جو بعد میں فراش خانہ ہوا، مرزا صاحب کا قیام کوچہ ہمیشری داس میں تھا جو جامع مسجد سے جانب غرب واقع ہے، اسی تنگ گلی میں داہنی طرف پنیا کے گھر کے پاس ایک دو منزلہ مکان تھا، مرزا صاحب اسی مکان میں آخر زمانے تک مقیم رہے، اس مکان میں قیام رکھنے میں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ اس مکان سے نہ صرف اصطبل قریب تر واقع تھا بلکہ سرکاری تار گھر بھی مرزا صاحب کی قیام گاہ سے بالکل متصل اور سامنے واقع تھا۔

رامپور کے حالات سناتے ہوئے مرزا صاحب نے ایک لطیفہ بھی سنایا بولے کہ جب ہم رام پور پہنچے اور ہمیں اصطبل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر یا بباطن حارج ہوئے، ایک روز عجیب واقعہ ہوا، صبح کو جب اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چپاں دیکھا، غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مشکی[1]

آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

یہ شعر گو ہماری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعائتوں سے کام لیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا، ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغے گئے تھے اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت کچھ معلوم کیا، اعلان بھی کیا کہ اس شعر کا کہنے والا اگر مجھ سے آکر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہونگا بلکہ اس کی شاعرانہ طباعی و ذہانت کی داد دوں گا۔ اور اس کی اس شاعرانہ نوک جھونک کے پیش نظر اس کی بے حد عزت کرونگا، لیکن

---

[1] غالباً مرزا صاحب کا یہ شعر اسی شعر یا اسی قبیل کے بعض اشعار کا جواب ہے ؎

روسیاہوں کو نہ دیکھیں نظر بد سے، و مفید، یا مشک سے قیمت میں کم ہے مرتبہ کافور کا

افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنف[1] کا پتہ نہ لگ سکا۔

۱۱ر مارچ ۱۸۹۹ء

کل پنجاب کا ایک قوال مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے تین شعروں کا ایک خمسہ پڑھا، شعر یہ تھے :۔

علاج دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا
تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا
دم آخر مری بالیں پہ ہے مجمع حسینوں کا
پھر آنا اے اجل اس وقت پردا ہو نہیں سکتا

مرزا صاحب نے قوال سے پوچھا کہ یہ کس کے شعر ہیں، اس نے جواب میں کہا آپ کے، مرزا صاحب نے پوچھا تم کو یہ شعر کہاں سے ملے اس نے کہا ایک رسالہ میں، دریافت ہوا کہ وہ رسالہ کہاں ہے۔ قوال نے کہا کہ میری قیام گاہ پر، مرزا صاحب کے حکم پر قوال نے اپنی قیام گاہ سے ایک مجلد کتاب منگوا کر پیش کی جس میں ایک رسالہ بھی مجلد تھا اور اس میں "خمسہ بر غزل داغ " کے تحت یہ تین شعر موجود تھے۔ مہتاب داغ کے بعد ایک مسودۂ دیوان مرزا صاحب کا کھو گیا تھا اور بہت سی غزلیں حافظے سے نکل چکی تھیں، مرزا صاحب نے خیال کیا کہ غالباً یہ اشعار اسی کھوئے ہوئے مسودے کے ہیں، چھپی ہوئی کتاب کو سند سمجھا

---

[1] نگار جنوری و فروری ۱۹۵۳ء میں محمد علی خاں اثر رامپوری لکھتے ہیں کہ "حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شعر میر احمد علی رسا رامپوری شاگرد شیخ علی بخش بیمار نے لکھا تھا اور کسی شاگرد سے اصطبل کے دروازے پر چسپاں کرا دیا تھا۔

گیا اور چونکہ یہ شعر مرزا صاحب کو بہت پسند آئے لہذا اسی وقت اور اشعار کہہ کر غزل پوری کر لی گئی، رات کو حبیب کنتوری کے یہاں مشاعرہ تھا، مرزا صاحب اس مشاعرے میں شریک ہوئے اور بلا تکلف اپنی یہ تازہ غزل مع قوال والے تینوں اشعار کے مشاعرے میں پڑھی، عام دستور کے مطابق مرزا صاحب کی یہ غزل بھی انکی زبان سے ادا ہوتے ہی زبان زد خاص و عام ہو گئی، مشاعرہ کے خاتمے پر لوگوں نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ تین شعر حفیظ خیرآبادی کے ہیں لوگوں کی ہمت مرزا صاحب سے توجہ کی نہ ہوئی میں نے آج صبح مرزا صاحب کی خدمت جو رات سنا تھا عرض کر دیا، بولے ہم نے تو ان اشعار کو اپنے نام سے چھپا ہوا دیکھ کر اپنا سمجھ لیا تھا اگر یہ اشعار ہمارے نہیں ہیں تو نہ سہی۔۔ اسی وقت یہ تینوں شعر غزل سے خارج ہوئے اور ان کی بجائے یہ تین شعر بیاض پر نقل کرائے گئے:۔

اشارہ اس نگہ کا روح افزا ہو نہیں سکتا
کہ جادو گر سے اعجاز مسیحا ہو نہیں سکتا

شکایت دوست کر سکتے ہیں تیری کر نہیں سکتے
کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے ایسا ہو نہیں سکتا

سوال وصل پر اسے داغ دلکی یکسی دیکھی
کہا منہ پھیر کر ظالم نے ایسا ہو نہیں سکتا

آج مرزا صاحب نے فرمایا کہ جس وقت میری دربار حیدرآباد میں کامیابی ہوئی اور منصب کا حکم ہوا اس وقت میں سخت بیمار تھا، درد نقرس کی زیادتی نے مجھے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ پیشاب پاخانے جانا دشوار تھا، جس وقت میری اس حالت کا اعلیٰ حضرت کو علم ہوا تو فرمایا کہ یہ بیماری تو امارت

کی نشانی ہے۔"

آج مرزا صاحب کو اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی نے ایک نہایت خوب صورت عطردان مرحمت فرمایا ہے، شام کو جب حسبِ معمول محفل گرم تھی مرزا صاحب نے بعض لوگوں کے اشتیاق دید کی بنا پر وہ عطردان منگوایا، ہر شخص نے نہایت ذوق و شوق سے اس عطردان کو دیکھا، بیضاوی رنگ کا چوبی عطردان تھا جس پر نقرئی و طلائی نقش و نگار تھے، اندر ایک درجن عطر کے چھوٹے چھوٹے نہایت خوبصورت شیشے کے کنٹر تھے جو مختلف عطریات سے لبالب تھے عطردان کے ڈھکنے کے اندر شیشہ لگا ہوا تھا، عطردان دیکھ کر سب نے بہت تعریف کی اور جب عطردان ملازم کو واپس کیا گیا تو مرزا صاحب بولے کہ آپ لوگ بہت بد مذاق ہیں، عطردان تو دیکھ لیا لیکن عطر نہیں دیکھا ذرا اس کی خوشبو سے بھی تو لطف اٹھایئے مجھے حکم ہوا کہ احسن تم سب لوگوں کے عطر لگاؤ میں نے اٹھ کر ایک شیشی عطردان سے نکالی اور لوگوں کے عطر لگانا شروع کیا سب سے پہلے میں استاد کی طرف بڑھا اور عطر لگایا اس کے بعد دوسرے لوگوں کے لگایا۔

آجکل اختر جان سے جو صورت کی رہنے والی ہے اور دو سو روپیہ ماہوار پر مرزا صاحب کی ملازم ہے، کچھ ناچاقی ہے، یہ ایک نوعمر حسین طوائف ہے مرزا صاحب کے پاس اس کی جوانی کی پذیرائی کے اسباب ناپید ہیں، صرف

گانا سننے اور دل بہلانے کے لئے نوکر رکھ چھوڑا ہے، لکھنؤ کے رہنے والے یہاں ایک منصف ہیں جو اختری جان پر بری طرح فدا ہیں مگر وہ داغ کی ملازم ہے اور داغ بادشاہ کے استاد ہیں۔ ظاہرا جوڑ توڑ ممکن نہیں لہذا چپکے چپکے ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں، اختر جان کبھی کبھی ان کے بھرّے میں آجاتی ہے اور یکایک آنا جانا ترک ہو جاتا ہے اور سمجھا بجھا کر اسے بلایا جاتا ہے، آج ایک ہفتے سے اس نے معمولاً آنا ترک کر دیا ہے، داغ صاحب کو اچھی صورت کے بغیر چین نہیں آج جمال نامی ملازم خاص کو حکم ہوا کہ اختر کے پاس جاؤ اور ہمارا اشتیاق ظاہر کرکے انہیں ساتھ لے آؤ، جمال بڑے باکمال ہیں گو بمشکل لکھ پڑھ سکتے ہیں لیکن بڑی اپج کے آدمی ہیں، بلا کا سلیقہ ہے انہی چرب زبان ہیں، مرزا صاحب کی صدہا غزلیں ورد زبان ہیں اور بڑے مزے لے کر گاتے ہیں، نقالی میں بھی طاق ہیں، الغرض وہ تشریف لے گئے۔ خوب بڑھایا چڑھایا اور ہر طرح ڈورے ڈالے لیکن اختر پر جو بھوت چڑھا تھا وہ نہ اترا اور وہ اس دفعہ کسی طرح آنے پر رضامند نہ ہوئی اور جب جمال نے اصرار کی حد کر دی تو صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مرزا صاحب سے کہہ دینا کہ میں تو میں میری بلا بھی نہ آئے گی ـــــ جمال واپس ہوئے تو جہاں انہوں نے اور سب باتیں بیان کیں وہیں یہ بھی فرمایا کہ اختر کہتی تھیں کہ مرزا صاحب سے کہہ دینا کہ "اب میری بلا بھی نہ آئے گی" مرزا صاحب اس جملے پر مسکرائے، ٹھنڈی سانس لی، اور کچھ توقف کرکے یہ شعر فرمایا ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئیگی

۳۱ر مارچ سنہ ۱۸۹۹ء

مرزا صاحب نے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے مکتبی استاد میر احمد حسین[1] صاحب تھے ان سے اکثر لڑکے مذاق کیا کرتے تھے ایک دفعہ مجھے بھی مذاق کی سوجھی، میر صاحب کی نشست پر جو کپڑا بچھا تھا اسکے نیچے گوکھرو کے کانٹے بچھا دیئے اور جہاں میں خود بیٹھتا تھا وہاں بھی گوکھرو بچھا دیئے، میر صاحب جب اپنی جگہ پر بیٹھے تو کانٹے چبھے وہ گھبرا کے کھڑے ہو گئے، ان کے سرین میں کانٹے گھس چکے تھے، ادھر میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر مولوی صاحب کو بتایا کہ میری جگہ پر بھی کسی نے کانٹے بچھا دیئے ہیں میر صاحب نے ہر چند پوچھ گچھ کی لیکن پتہ نہ لگ سکا کہ یہ کسکی حرکت ہے، کانٹوں کی تکلیف سے اس دن میر صاحب نے ہم سب کو چھٹی دیدی۔

میر احمد حسین صاحب شطرنج کے بھی بڑے شوقین تھے جب کوئی اور نہ ملتا تو مجھ سے ہی شطرنج کھیلتے لیکن میری ہمیشہ مات ہوتی تھی، ایک دفعہ صرف مولوی صاحب کو مات دینے کی خاطر سے ان کو بھنگ کی مٹھائی کھلادی اور وہ اسے

---

[1] میر احمد حسین صاحب شاہی قلعہ میں مرزا داغ کو پڑھایا کرتے تھے، یہ میر غلام حسین صاحب شکیبا کے لڑکے تھے، شکیبا کا میر تقی میر کے خاص شاگردوں میں شمار تھا فارسی کی درسی کتابیں مرزا صاحب نے قلعہ میں میر احمد حسین صاحب سے ہی پڑھی تھیں

کھا کر ایسے ست پٹائے کہ پیادے آگے کے بجائے پیچھے سرکانے لگے اور اس طرح میں نے انہیں مات دیدی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ بچپن کا زمانہ بھی عجیب زمانہ ہوتا ہے، ایک دفعہ یاروں کے ساتھ ہولی کا تماشہ دیکھنے کے لئے گئے، سب لڑکے نو عمر تھے، ایک جگہ ایک بڑے میاں سر گھٹائے بیٹھے تھے ان کا چکنا چکنا سر دیکھ کر ہاتھوں میں کھجلی مچنے لگی، میں بے اختیار ہو گیا، بڑھ کر بڑے میاں کے سر پر ایک دھول جمایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

طبیعت میں چونکہ شرارت بچپن سے تھی لہذا جوانی کے زمانے میں بھی اکثر حرکتیں ایسی سرزد ہوئیں جن کو آج یاد کر کے حیرت ہوتی ہے یہ فرما کر مرزا صاحب بولے کہ ایک مرتبہ دلی کے شاہی خاندان میں چند یورپین لوگوں کی دعوت تھی، مرزا صاحب بھی اس دعوت میں شریک تھے، ایک باغ میں دعوت کا انتظام تھا لوگ ابھی جمع نہیں ہوئے تھے کہ مرزا صاحب کو پیشاب کی حاجت ہوئی، رات کا وقت تھا، رفع ضرورت کے لئے باغ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، ایک انگریز جو باغ کی ایک روش پر اسی جانب ٹہل رہا تھا مجھے دیکھ کر چونکا اور چور کا شبہ کر بیٹھا اور ڈانٹ کر پوچھا. کون ؟ میں نے بھی جواب میں کہا کون ؟ انگریز نے اس کے بعد انگریزی میں کچھ کہنا شروع کیا میں نے اس کی بھی نقل اتاری اور انگریزی لب و لہجہ بنا کر جواب دیا انگریز نے پتھر اٹھا کر مارا، میں نے بھی پتھر کا جواب پتھر سے دیا، انگریز نے شور مچایا میں موقع کی نزاکت کا اندازہ کر کے وہاں سے ہٹ آیا۔ انگریز کے شور سے وہ لوگ جو دوسری طرف بیٹھے تھے دوڑ پڑے۔ اس انگریز نے ان

لوگوں کو بتایا کہ اس باغ میں کوئی چور ہے اور جو گزرا تھا وہ سب بیان کیا لوگ اس کا بیان سن کر تلاش میں مصروف ہوئے، مشعلیں منگوائی گئیں، چاروں طرف تلاش و جستجو شروع ہو گئی، میں اس عرصے میں تلاش کرنے والے مجمع میں شریک ہو چکا تھا، بڑی دیر تک تلاش ہوتی رہی لیکن بے سود بالآخر تھک کر لوگ اپنی اپنی جگہ پر آ گئے مگر یہ موضوع بہت دیر تک زیرِ بحث رہا۔

مرزا صاحب نے آج ایک عجیب بات بتائی، انہوں نے فرمایا کہ رام پور کے اکثر مشاعروں میں لوگ میرے اشعار سن کر مجھے گالیوں سے داد دیا کرتے تھے رام پور کے پٹھانوں کا یہ دستور تھا کہ جب میں پڑھنے بیٹھتا چاروں طرف سے اکٹھا ہو کر میرے پاس آ بیٹھتے یا اگر مجھ تک پہنچنا ممکن نہ ہوتا تو جہاں ہوتے ہمہ تن متوجہ ہو جاتے اور میرا جو شعر پسند آتا بے اختیار گالیاں دیا کرتے، کچھ لوگوں نے پوچھا کہ آخر یہ کون تہذیب ہے، جواب ملا کہ داغ کے کلام کی یہ تاثیر ہے کہ بے اختیار ان کے اشعار کی تعریف اور داد میں کہنا پڑتا ہے کہ ظالم نے مار ڈالا۔ اف قتل کر ڈالا، کم بخت نے دل کا کام تمام کر دیا، ستم کر دیا اور قاتل نے غضب ڈھا دیا وغیرہ وغیرہ۔

ایک دفعہ نواب کلب علی خاں نے نواب عبداللہ سے پوچھا کہ داغ کے متعلق کیا خیال ہے، جواب دیا کہ "بتیڑے میں گلاب بھرا ہے"، مطلب یہ کہ صورت تو کالی ہے لیکن داغ کا باطن گلہائے معانی کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔

آج شام کو عبدالحمید صاحب آزاد کو پیاس معلوم ہوئی اور پانی پینے کی خواہش ظاہر کی، مرزا صاحب نے پانی لانے کا حکم دیا، ایک لڑکی جس کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی ہوگی پانی لے کر حاضر ہوئی، ہوا زور کی چل رہی تھی، لڑکی کا دوپٹہ ہوا سے سرک گیا، اس نے گھبراہٹ میں گلاس چھوڑ کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ مرزا صاحب کی نظروں نے اس سین سے لطف اٹھایا، لڑکی تو فوراً چلی گئی، لیکن ایک فطری شاعر کے جذبات شعری میں ہلچل ڈال گئی۔ مرزا صاحب نے برجستہ یہ شعر فرمایا اور مجھے حکم ہوا کہ لکھ لیا جائے شعر یہ تھا ؎

بادِ صبا بھی کر نہ سکی اس کو بے حجاب
سینے پہ ہاتھ آگئے جب شانہ کھل گیا

۱۱ر جولائی ۱۸۹۹ء

آج مرزا صاحب اپنے استاد خاقانیٔ ہند جناب ذوق کے طریقۂ اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے بولے کہ ایک روز میں نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے ؎

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا　　اس طرف بھی خرام کرنا تھا

استاد نے جب یہ مطلع سنا جھوم گئے، بہت تعریف کی، کئی بار پڑھوا کر سنا اور فرمایا، داغ یہی کلام تمہارا تمہیں زندہ رکھے گا۔ میں نے دوسرا شعر پڑھا ؎

نہیں اٹھتا ستم تو حضرتِ دل　　عاشقی کو سلام کرنا تھا

اس شعر پر استاد نے فرمایا کہ اصلاح طلب ہے، پوری غزل میں یہی ایک شعر ایسا تھا جس پر اصلاح طلب ہونے کا اطلاق فرمایا۔ اس شعر پر اصلاح دیتے ہی والے تھے کہ قلعہ شاہی سے چوبدار طلب میں پہنچا اور استاد ادھر روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز حسب معمول جب سہ پہر کو میں حاضر ہوا تو بولے چلتے ہو ذرا نہر کے کنارے چل کر ٹہلیں، میں نے کہا جیسی مرضی، میں حضرت کے ساتھ ہو لیا، نہر پر پہنچکر ٹہلنا شروع ہوا۔ ٹہلتے ٹہلتے بولے کہ کل والی غزل کا وہ کون سا شعر تھا جس پر تم نے سلام کا قافیہ باندھا ہے، میں نے شعر پڑھا، ذرا سے توقف کے بعد میری پیٹھ پر ایک دوہتڑ مارا اور بولے کہ دیکھو اب شعر ہوا اور میرے شعر کی یوں اصلاح فرمادی۔ ؎

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل　　　عاشقی کو سلام کرنا تھا

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ذوق سے ۱۴ سال مسلسل اصلاح لی ۱۲ سال کی اصلاح کے بعد اکثر استاد کہا کرتے کہ اب تم اس قابل ہوگئے ہو کہ کہو تو غالبؔ سے لڑا دوں کہو تو مومنؔ سے بھڑا دوں، استاد اور غالبؔ مومن میں اکثر چشمک رہا کرتی تھی، مجھے ہونہار پاکر وہ ایسا کہا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کی اس ہمت افزائی اور ارشاد پر اپنے نفس کو متاثر نہیں ہونے دیا اور حتی المقدور استاد کے ان ہمعصر شعراء کا ادب کرتا رہا اور ان کو استاد سمجھتا رہا۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں سب سے پہلے فتح الملک بہادر مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر کا شاگرد[۱] ہوا، دو چار غزلیں انہیں دکھائیں، خود

---

[۱] حاشیہ صفحہ ۴۶ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ولی عہد بہادر نے مجھ سے فرمایا کہ میں حضرت ذوق کا شاگرد ہو جاؤں، مرزا فخرو ہی نے داغ تخلص قرار دیا تھا، میں حضرت ذوق کا شاگرد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں ہوا تھا، جہاں شاہ ظفر اور ولیعہد بہادر بھی تشریف فرما تھے، نواب فتح الملک بہادر مرزا فخرو نے میری طرف سے حضرت ذوق کی خدمت میں ایک دوشالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں، استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی، اس روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت استاد کے در دولت پر حاضر ہوتا، مغرب کے بعد وہاں سے واپسی ہوتی، بادشاہ کی غزل اور میری غزل پر خود اپنے دست قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے، باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا اور استاد اصلاح دیتے جاتے، لیکن جب کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ہی ملاحظہ کر کے اصلاح فرمادیا کرتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ۶۳) ؎ مالک رام صاحب ایم اے اپنے مضمون "تلامذہ غالب" میں لکھتے ہیں کہ مرزا داغ نے تین برس تک مرزا زین العابدین عارف سے اصلاح لی، اس زمانے میں ان کا تخلص داغ کے بجائے "مرزا" تھا جو نواب سعید الدین احمد خاں کے والد نیر درخشاں کا عطا کیا ہوا تھا، بعد میں ولی عہد مرزا فخرو نے جب ان کو ذوق کے حوالے کیا تو حضرت ذوق نے ان کا داغ تخلص رکھا، یہ گویا مرزا فخرو پر در پردہ ایک چوٹ تھی۔ ممکن ہے مرزا داغ نے کچھ عرصے ولی عہد بہادر سے بطور خوشنودی اصلاح لی ہو۔

مرزا صاحب کو اپنے بچپن کے واقعات[1] زیادہ یاد نہیں انکا فرمانا ہے کہ میں نے اپنے بچپن کے واقعات زیادہ تر اپنی والدہ اور خالہ کی زبان سے سنے، میرے والد نواب شمس الدین خاں ریاست فیروز پور جھرکہ کے نواب تھے، میری عمر ابھی پانچ سال کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ والد کو پھانسی ہو گئی، پھانسی کی وجہ یہ تھے کہ فریزر نامی ایجنٹ گورنر جنرل اور نواب صاحب کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے نواب شمس الدین خاں اور انکے برادران نواب ضیار الدین خاں و نواب امین الدین خاں کے تعلقات بھی

---

[1] یہ واقعات تو وہ ہیں جو مولانا احسن صاحب مارہروی نے حضرت داغ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھے ہیں، ایک شاگرد کی حیثیت سے مولانا نے واقعات ذرا محتاط انداز میں لکھے ہیں لہذا اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے۔

نواب شمس الدین خاں نواب احمد بخش خاں کے بڑے بیٹے تھے، نواب احمد بخش خاں کے دوسری بیوی سے بھی دو لڑکے تھے جن کو امین الدین خاں اور ضیار الدین خاں کے نام سے شہرت ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم اپنی کتاب مضامین سلیم کے صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ فیروز پور جھرکہ کے قریب قصبہ تجارہ میں دو طوائفیں رہتی تھیں ایک کا نام بڑی جان عرف جلّو، دوسری کا موسی جان عرف کلّو تھا، ایک نواب احمد بخش خاں کی داشتہ تھی جس سے شمس الدین خاں پیدا ہوئے، دوسری مہاراجہ الور کی داشتہ تھی جس سے بلونت سنگھ پیدا ہوا اس طرح بلونت سنگھ اور شمس الدین خاں خالہ زاد بھائی تھے، مہاراجہ الور کا انتقال ہوا تو جانشینی کا مسئلہ پیش آیا نواب احمد بخش خاں، بلونت سنگھ کے حق میں تھے، شیودھان سنگھ جو

خراب تھے، فریزر مذکور نواب شمس الدین خاں کی مخالفت اور دوسرے بھائیوں کی موافقت میں تیز دم تھا، یہ چیز نواب شمس الدین خاں کو سخت ناگوار تھی اور چونکہ وہ دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں با اثر و بارسوخ تھے اس لیے فریزر کو اکثر معاملات میں زک اٹھانا پڑتی تھی، یہی مخالفت رنگ لائی اور آخر کار فریزر کے قتل کی وجہ بنی، فریزر کو کسی نے قتل کیا ہو نواب کی مخالفت کی شہرت نے انہیں مجرم بنا دیا، بھائیوں کی مخالفت نے اور جرم کو ثابت کرا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کو اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی

(فٹ نوٹ مسلسل)

جائز وارث تھا راجپوتوں کی پشت پناہی پر نواب صاحب کا مزاحم ہوا، نواب صاحب نے بیٹے کی جانشینی کا لالچ دلا کر مسلمان طوائف کو ستی کرا دیا، راجپوت اس واقعہ سے سخت برگشتہ ہو گئے اور انھوں نے نواب کو طعنہ دیا کہ دیکھیں گے کہ تم اپنی جاگیر امین الدین خاں و ضیاء الدین خاں سے قطع نظر کر کے شمس الدین خاں کو دیدو گے نواب صاحب نے یہ بھی کر دکھایا چنانچہ ۱۸۲۶ء میں شمس الدین خاں کو فیروز پور جھرکہ اور نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کو لوہارو کا علاقہ تفویض کر کے خود گوشہ نشین ہو گئے، اور اس طرح ثابت کر دیا کہ جو بات وہ مہاراجہ الور سے چاہتے تھے اس پر وہ خود بھی عامل تھے، اور رنگ و نسل کی تفریق کے واقعی وہ قائل نہ تھے، اکتوبر ۱۸۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا، نواب شمس الدین خاں نے بڑے بیٹے کی حیثیت سے دعویٰ کیا کہ پرگنہ لوہارو بھی میرے سپرد ہو اور چھوٹے بھائیوں کو رواجِ خاندان کے مطابق گزارہ ملا کرے، چھوٹے بھائیوں نے یہ

دیدی گئی، محمد مظفر خاں گرم رامپوری نے اس واقعہ کا معمہ کی شکل میں قطعہ تاریخ کہا جس کو اگر الٹا جائے تو ۱۲۵۲ ہوتے ہیں۔

یہ دست درازی ستم کس سے بیاں ہو — بے جرم و گناہ مسندِ نواب کو الٹا
تاریخ معمہ میں نئی طرز سے لکھ گرم — کیا چرخ نے نوابیِ سہراب کو الٹا

۱۸۴۴ء میں مرزا داغ اپنی خالہ کے ہمراہ رام پور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کے زیرِ پرورش رہے، ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں تخت نشین ہوئے تو انہوں نے مرزا صاحب کی خالہ عمدہ بیگم صاحبہ کا سودا ؤ

(فٹ نوٹ مسلسل) دعویٰ کیا کہ ہمارے والد کے جمع کئے ہوئے جواہرات، روپیہ اور بہت سی چیزوں پر نواب شمس الدین خاں قابض ہیں ان سے ہمیں حصہ دلایا جائے اس مقدمے کا فیصلہ ریذیڈنٹ دہلی نے شمس الدین کے خلاف کیا لیکن حکومتِ ہند نے اس فیصلہ کو نامنظور کرتے ہوئے لوہارو کا علاقہ نواب شمس الدین کے ہی سپرد کر دینا تجویز کیا، چنانچہ نومبر ۱۸۳۱ء میں لوہارو کا علاقہ نواب شمس الدین کے زیرِ اہتمام ہو گیا، دونوں بھائیوں نے اسکے خلاف چارہ جوئی کی اور ولیم فریزر نے جو نواب احمد بخش خاں کا گہرا دوست تھا، نواب شمس الدین خاں کے خلاف رپورٹ کی، حکومت نے اس وقت تو اسے منظور نہیں کیا، مگر جب امین الدین احمد خاں کلکتے گئے تو انکے حق میں فیصلہ کر دیا، نواب شمس الدین خاں کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ فریزر کی ذاتی کوششوں سے ہوا، چنانچہ تعلقات خراب ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک ملازم مسمیٰ کریم خاں عرف بھرمارو کو فریزر کے قتل پر متعین کیا اور اسنے ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو شب کے وقت قتل کر دیا، تحقیقاتِ قتل کے نتیجے میں نواب مجرم قرار پائے اور ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو انہیں پھانسی دیدی گئی۔ فریزر اور نواب کی مخالفت کی مذکورہ بالا وجہ

ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں کے زمانے تک جاری رہا۔ مرزا صاحب کا قیام رامپور میں چار سال تک رہا، رام پور میں وہ مولوی غیاث الدین رامپوری (صاحب غیاث اللغات) کے زیر تعلیم رہے، مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ سکندر نامہ میں نے نواب یوسف علی خاں سے پڑھا ۱۸۴۴ء میں داغ صاحب واپس دہلی ہوئے ان کی والدہ چھوٹی بیگم نواب شوکت محل صاحبہ، صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے دامنِ عاطفت میں پناہ لے چکیں تھیں، مرزا صاحب تیرہ چودہ

(فٹ نوٹ مسلسل) کے علاوہ بعض روایتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کو اگرچہ حقیقی متصور نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے بیان سے فریزر کے کیریکٹر کا اندازہ ممکن ہے روایت ہے کہ شمس الدین خاں کے دو بہنیں بھی تھیں جن میں سے ایک کا نام جہانگیرا بیگم تھا، ولیم فریزر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک عیاش طبع انسان تھا، اس نے کسی طرح جہانگیرا بیگم کو دیکھ لیا اور نہایت والہانہ انداز میں خود شمس الدین خاں سے اپنی محبت وگرویدگی کا اظہار کیا جو نواب کو بہت ناگوار گذرا اور یہی چیز اس کے قتل کی وجہ ہوئی، ایک روایت ہے کہ فریزر مذکور کا چھوٹی بیگم جو نواب سے وابستہ تھیں کچھ واسطہ ہو گیا تھا اور اس صورت حال نے اسے قتل کرایا نواب شمس الدین خاں نے اپنے بعد ایک بیاہتا بیوی اور اس کے بطن سے دو بیٹیاں چھوڑیں، ان کے متعلقات میں وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم بھی تھیں، مرزا داغ انہیں چھوٹی بیگم کے بطن سے چہار شنبہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے تھے، چھوٹی بیگم محمد یوسف

سال کی عمر میں دہلی واپس پہونچے اور داخل قلعہ ہوئے، نہایت آرام و آسائش سے زندگی بسر ہونے لگی، مرزا صاحب کا فرمانا ہے کہ قلعہ معلیٰ کی فضا رقص و سرود کے جلسوں اور بزم شعر و ادب سے گونج رہی تھی، ایسے حالات میں مردہ دل بھی خاموش نہیں رہ سکتے، ہم تو پھر بھی ازل ہی سے بھکا ہوا دل و دماغ لے کر آئے تھے، دل میں عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہوگئی تو دماغ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوا، مرزا فخرو ولی عہد اور شاہ ظفر کی نظر التفات نے وہ کام کیا کہ بہت جلد شاعری میں چار چاند لگ گئے

(فٹ نوٹ مسلسل) سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھیں، یوسف کشمیری النسل تھے، سادہ کاری آبائی پیشہ تھا لیکن ڈیرے داری بھی کیا کرتے تھے، انکے دو بیٹیاں تھیں جو یوسف والیاں مشہور تھیں بڑی لڑکی کا نام عمدہ بیگم تھا جو نواب یوسف علی خاں سے وابستہ تھیں دوسری لڑکی یعنی چھوٹی بیگم نواب شمس الدین خاں سے وابستہ تھیں، ۱۶ رجب ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء کو انہیں چھوٹی بیگم نے نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کو غسل صحت کی مبارکبادی کا ایک خط لکھا جو ان کی اصلیت و قومیت پر روشنی ڈالتا ہے، ملاحظہ ہو:-

ـــــــ "از خارج اصغا نمودہ کہ عزم ملازمان حضور در موسم بہار برائے سیر و تفریح حضرت کشمیر جنت نظیر کہ وطن اصلی بزرگان ماست تقرر یافتہ"

نواب شمس الدین کے پھانسی پا جانے کے بعد چھوٹی بیگم دہلی آرہیں، نواب صاحب کے پھانسی پا جانے کے بعد چھوٹی بیگم کو بہت پریشان ہونا پڑا، نواب کے وابستگان میں ایک عورت چمپا بھی تھی وہ فرار ہوگئی، چھوٹی بیگم روپوش ہوگئیں، انگریز ان جھگڑوں کی ایک وجہ چھوٹی بیگم کو بھی سمجھتے تھے، نواب کی پہلی بیوی جانی بیگم دختر مرزا مغل اپنے میکے میں تھیں

اور صہبائی، آزردہ اور غالب جیسے باکمالوں سے داد ہنر ملنے لگی، خاقانی ہند جناب ذوق، شاہ دہلی اور ولی عہد کے استاد تھے، انہیں سے مرزا صاحب کو تلمذ حاصل ہوا اور مذاق شعر دن دونا رات چوگنا ترقی کرنے لگا۔ ۱۰ رجولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو نے ہیضے میں انتقال فرمایا، ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا، ستمبر میں مرزا صاحب بھی خانہ برباد ہوئے اور قلعہ معلی

(فٹ نوٹ مسلسل) انہوں نے چھوٹی بیگم کی وجہ سے نواب کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا تھا چھوٹی بیگم بالآخر انگریزوں کے دستِ تظلم سے بچنے کے لئے آغا تراب علی سے وابستہ ہو گئیں اور مرزا داغ اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ساتھ رام پور چلے گئے، ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ میں آغا تراب علی سے چھوٹی بیگم کے ایک لڑکا ہوا جن کو آغا مرزا شاغل کے نام سے شہرت ہے یہ داغ سے گیارہ سال چھوٹے تھے ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ میں چھوٹی بیگم کی رسائی قلعہ میں ہو گئی اور مرزا فخرو سے وابستہ ہو گئیں اور کل تک جو یوسف والیاں مشہور تھیں نواب شوکت محل بیگم کہلائیں۔ مرزا فخرو ولی عہد سے ۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ میں مرزا خورشید عالم پیدا ہوئے، مرزا داغ جو اس وقت تک رامپور میں اپنی خالہ کے پاس تھے دہلی واپس بلائے گئے اور شاہی قلعہ میں شاہزادوں کی طرح پرورش ہونے لگی، ولی عہد بہادر کے انتقال نے پھر مرزا داغ اور انکی والدہ کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا، داغ اپنی خالہ عمدہ بیگم کا سفارشی خط لے کر رامپور پہونچے اور مصاحبینِ ریاست میں شمار کئے جانے لگے، چھوٹی بیگم غدر کے بعد ایک انگریز مارسٹن بلاک نامی سے وابستہ ہو گئیں جن سے ایک لڑکی مسیح جان عرف بادشاہ بیگم تولد ہوئیں، مرزا داغ کی یہ بہن شاعرہ تھیں، خفی تخلص تھا، لطیفہ سنجی و خوش نویسی میں مہارت خاص حاصل تھی، فارسی اور انگریزی سے خوب واقف تھیں، سب سے آخر میں

کو خیر باد کہنا پڑا، رام پور پہونچے اور شاہی مصاحبین میں شامل ہو گئے
۴ر اپریل ۱۸۶۶ء میں بہ زمانۂ نواب کلب علی خاں مرزا صاحب ریاست
میں بطور افسر اصطبل و فراش خانہ باقاعدہ ملازم ہو گئے جس کا سلسلہ
جولائی ۱۸۸۶ء تک قائم رہا۔

(فٹ نوٹ مسلسل) چھوٹی بیگم کا واسطہ دکن کے ایک صاحب سے ہو گیا تھا جن سے بھی کہا جاتا ہے کہ دو لڑکے پیدا ہوئے لیکن یہ قیاس ہی قیاس ہے مستند کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مرزا داغ کی والدہ چھوٹی بیگم کا انتقال اگست ۱۸۷۹ء مطابق شعبان ۱۲۹۶ھ میں ہوا جیسا کہ نواب یوسف علی خاں کے اس خط سے واضح ہوتا ہے جو انہوں نے مرزا داغ کی عرضی کے جواب میں مورخہ ۱۷ر شعبان ۱۲۹۶ھ کو تحریر کیا تھا:۔

عرضی ایشاں مشعر حال انتقال والدۂ ایشاں باستدعائے مبلغ
۲ صد روپیہ بضرورت مصارف بملاحظہ گزشت و بدریافت انتقال والدۂ
ایشاں نہایت رنج و افسوس گردید۔

مرزا فخرو کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا اس وقت چھوٹی بیگم کی عمر ۴۳ یا ۴۴ سال کی تھی ۱۸۷۹ء میں انہوں نے انتقال کیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں ۶۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، شمس الدین خاں کی اولاد نرینہ میں صرف مرزا داغ ہی تھے دوسری بیوی سے لڑکیاں تھیں، قاعدے سے ریاست کے وارث مرزا داغ ہی ہوتے تھے انہوں نے ریاست کی بازیافت کے لئے مقدمہ بھی لڑا لیکن وقت بدل چکا تھا، حکومت کی نگاہ میں انکے باپ ایک انگریز کے قاتل تھے بھلا وہ کیسے کامیاب

۲۲ اگست ۱۸۹۹ء

آج کی نشست میں مرزا صاحب بہت دیر تک ورودِ حیدر آباد کے واقعات سناتے رہے انہوں نے بتایا کہ میں نے حیدر آباد کی امیدواری کے زمانے میں کوئی چھ ہزار روپیہ خرچ کیا، جب امیدواری کرتے کرتے بہت تنگ آگیا تو ایک عرضی سر وقار الامراء کی خدمت میں، ایک درخواست افسر جنگ بہادر کو اور ایک محبوب یار جنگ کے پاس روانہ کی اور ان سب میں یہ اظہار کیا کہ یہاں امیدواری کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں اور اب وطن جانا چاہتا ہوں کچھ خرچ کا بندوبست کرلاؤں تو پھر یہاں آکر امیدواری کروں، میری یہ عرضیاں بے سود رہیں، لاچار وطن واپس ہوا، بی بی نے خوب آوازے کسے کہ حیدر آباد سے تشریف لا رہے ہیں ذرا ہمیں بھی تو حیدر آباد کی کمائی دکھاؤ میں اس نیک بخت بی بی سے کیا کہتا اور وہ کیا سمجھتیں، میرے دلی چلے جانے کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام کو معلوم ہوا کہ داغ مایوس ہو کر دلی چلے گئے، وقار الامراء سے فرمایا کہ خط بھیج کر انہیں

(فٹ نوٹ مسلسل) ہو سکتے تھے، خاندان کے لوگوں نے بھی مدد نہیں کی، نتیجہ یہ ہوا کہ کامیاب نہیں ہو سکے، اور رنگ ونسل کے جس فرق و امتیاز کو داغ کے دادا نے نواب شمس الدین خاں کو ریاست فیروز پور جھرکہ دے کر مٹا دیا تھا، پھر قائم ہو گیا، اور داغ آبائی ریاست وحکومت سے محروم ہو گئے مگر قدرت نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ داغ نے تمام عمر تاجدار سخن کی حیثیت سے بسر کی اور دبیر الدولہ جہاں استاد فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ کہلائے۔

بلاؤ، انہوں نے دلی مجھے خط لکھا، میں نے آنے کا وعدہ تو کیا مگر یہ بھی لکھا کہ ایسا نہ ہو پھر میں وہاں سے ناکام واپس آؤں، میں نے جو ۲ ہزار روپے حیدرآباد میں خرچ کئے تھے وہ ایک مکان رہن رکھ کر یا دوستوں سے قرض لیکر گئے تھے اب جو بلاوا آیا تو مکان بیچنا پڑا لیکن یہاں پہنچکر پھر ایک برس گزر گیا، اور کوئی شنوائی نہ ہوئی، میرا دل پھر اچاٹ ہوا، پھر اعلیٰ حضرت کے بعض مصاحبین کی خدمات میں معروضات پیش کئے اور کہا کہ میں جاتا ہوں، ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰحضرت کی سواری نکلی۔ صدر میں اعلیٰحضرت جلوہ فرما تھے پائیں میں دو مصاحب تھے جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی، میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا، شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو یہ میں نہیں دیکھ سکا، دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپیہ کا منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے، یہ خبر عام طور پر مشہور ہو گئی لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لئے آنے لگے ہیں میں نے جب اعلیٰ حضرت کے بعض مقربین سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی لیکن اس واقعہ کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دلی دور است کے مصداق کچھ نہیں۔ ایک دفعہ میں وقارالامراء سے ملنے کیلئے گیا، انہوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی میں ہی مجھے بلا لیا، میں وہاں ایک گاڑی پر پہنچا۔ وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے میں ان کا انتظار کرنے

لگا، اتفاق دیکھئے ٹہلتے ٹہلتے اعلیٰ حضرت بھی ادھر نکلے آئے میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا کہاں ہیں، اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام بتایا گیا جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے، گھوڑے پر سوار تھے، میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آگئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے جو اس وقت میری جیب میں تھے نذر گزرانے، اعلیٰحضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں ان کے ساتھ ہولیا، ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سنانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی :-

دیکھے منصور اگر آج زمانا تیرا
ہو انا الحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا

داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانا تیرا
وہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانہ تیرا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے یہ دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت نے زبانِ مبارک سے فرمایا کہ اس میں کیا شک ہے، جس وقت ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سنے مجھے یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا، اسی غزل کا ایک شعر ہے سہ

مدعی دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ
کل ہمارا تھا جو ہے آج زمانا تیرا

مرزا صاحب بولے کہ میں نے یہ شعر بہت زور دیکر پڑھا، اعلیٰ حضرت بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ مجھ سے یہ شعر پڑھوایا۔ اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا سہ

ترک عادت[1] سے مجھے نیند نہیں آنیکی
کہیں نیچا نہ ہوا ہے گور سرہانا تیرا

---

[1] حاشیہ صفحہ ۷۵ پر دیکھئے۔

میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا فسردہ ہو گئی، اعلیحضرت بھی متاثر تھے لیکن شاہی محل میں اس طرح کی فسردگی بھی مجھے گوارا نہ تھی فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی :-

غزل

کس وجہ سے لب پر مرے فریاد نہ آتی — وہ چوٹ نہیں کھائی تھی جو یاد نہ آتی

اے شعبدہ گر تجھ کو ہزاروں ستم آتے — اک طرزِ دل آزاری و بیداد نہ آتی

گر جان گئی عشق میں پر نام تو پایا — کھنے میں بھی کیا محنت فرہاد نہ آتی

اس وحشتِ دل نے مجھے دیوانہ بنایا — ورنہ کبھی تم تک مری فریاد نہ آتی

اک عمر سے ہوں نغمہ سرا کنجِ قفس میں — اب بھی مجھے دلداریٔ صیاد نہ آتی

ہے فیضِ الٰہی میں کمی کون سی اے داغ
کیوں جوش پہ یہ طبعِ خداداد نہ آتی

---

۲۳ راپریل ۱۹۰۰ء

آج لقمان الدولہ جناب[1] ڈل تشریف لائے۔ احباب و شاگردانِ داغ

---

[1] ایک شاہی طبیب تھے اور نواب محبوب علی خاں کی ایک صاحبزادی کے طبیب خاص تھے داغ کے احباب میں سے تھے اور بڑے مخلص اور پابند وضع بزرگ تھے، لقمان الدولہ خطاب تھا

(فٹ نوٹ صفحہ ۷۴) مہتاب داغ میں یہ غزل ۱۵ اشعار کی دی گئی ہے لیکن اس میں یہ شعر نہیں ہے غالباً مرزا داغ نے یہ شعر اس سے نکال دیا ہوگا۔ یا سہواً چھوٹ گیا۔ (دیکھو مہتاب داغ صفحہ ۱۵۱)

شریک بزم تھے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد لوگوں نے دل صاحب سے غزل سنانے کی فرمائش کی انہوں نے فرمایا کہ اس وقت کچھ یاد نہیں آرہا ہے اس پر اور اصرار ہوا، دل صاحب جب مجبور ہو گئے تو غزل شروع کی، چاروں طرف سے داد ملنے لگی، خود مرزا صاحب نے کئی اشعار پر کافی داد دی لیکن جب دل صاحب نے مقطع پڑھا تو سب حیران رہ گئے وہ غزل انکی نہیں تھی بلکہ مرزا صاحب کی ہی ایک بہت پرانی غزل انہوں نے سنا دی، مرزا صاحب چونکہ خود بعض اشعار کی تعریف کر چکے تھے بہت خفیف ہوئے اور بولے کہ سہو کی اب یہ حالت ہو گئی ہے مجھے اب اپنا ہی کلام یاد نہیں رہتا پھر بولے کہ جوانی میں یہ عالم تھا کہ ہزاروں اشعار اردو و فارسی کے مجھے یاد تھے اب یہ حال ہے کہ چند ہفتوں کے کہے ہوئے اشعار یاد نہیں رہتے احسن بولے کہ یادداشت تو حضرت آپ کی اب بھی اچھی ہے یہ کہئے کہ اس کثرت سے ہر نوعیت کے اشعار آپ نے فرمائے ہیں کہ ان کا لوح ذہن پر محفوظ رہنا مشکل ہے مرزا صاحب بولے کہ ہاں یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے لیکن عمر کے تقاضے سے بھی مفر نہیں، جوانی کے زمانہ میں تمام قوتیں زوروں پر تھیں ہمارا حافظہ ایسا تیز تھا کہ کبھی مشاعرے میں غزل کاغذ یا بیاض دیکھ کر نہیں پڑھی، برائے نام پرچہ ہاتھ میں رہا کرتا تھا۔

مرزا صاحب نے فرمایا کہ استاد ذوق نے تمام عمر میں ایک شعر اپنا مجھے دیا تھا اور وہ یہ کہ ؎

رکھے قدم سنبھل کے رہِ عشق میں وہی
آگے بھی جس کو ہو کبھی ٹھوکر لگی ہوئی

یہ شعر استاد نے مجھے دیا اور ایک مصرع انہوں نے مجھ سے مانگ لیا، وہ مصرع یہ تھا۔ ؎

رکھیگی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس زمین میں استاد ذوق نے جو غزل فرمائی تھی اس کا بھی ایک لطیفہ ہے، میرا مصرع لے کر وہ شعر بنا چکے تھے، پوری غزل کی فکر تھی ایک روز پاخانے میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے مجھے آواز دی اور فرمایا کہ شعر لکھو میں نے قلم دوات سنبھال کر عرض کیا کہ ارشاد، استاد نے پاخانے سے برجستہ فرمایا ؎

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

پاخانے سے برآمد ہوئے تو برابر فکر میں مستغرق تھے۔ میں نے خیال کیا کہ دوسرے شعر کی فکر میں ہیں، کچھ دیر کے بعد بولے، داغ ایک مطلع اور ہو گیا، لکھو ؎

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اک پھانس سی کلیجے کے اندر لگی ہوئی

یہ مطلع فرما کر استاد دوسرے شعر کی فکر میں غلطاں ہوئے ادھر میرے ذہن میں بھی ایک مطلع آ گیا، استاد سے عرض کیا کہ حضور ایک مطلع

میرا بھی سن لیجئے، فرمایا سناؤ ؎

یہ کس کی لو ہے اے دل مضطر لگی ہوئی
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی[1]

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے اور شعر پر شعر فرما رہے تھے ادھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس منٹ میں استاد و شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہو گئیں، استاد نے فرمایا دونوں غزلیں صاف کر لو میں نے عرض کیا کہ میری غزل پر اصلاح فرما دیجئے تو پھر اکٹھی دونوں غزلیں صاف کر لوں، حکم ہوا سناؤ، غزل سنتے رہے، حسب موقع اصلاح بھی دیتے رہے، میں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

بے شک ہے کچھ لگاؤ جو کرتا ہے یہ گریز
زاہد سے دخت رز ہے مقرر لگی ہوئی

بہت تعریف کی اور بولے کہ بھائی ہم سے یہ قافیہ چھوٹ گیا اور تم لے اڑے، کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے اچھا اس قافیہ میں ہماری

---

[1] حیرت ہے کہ مصطفےٰ خاں شیفتہ کا یہ مصرع داغ نے کس طرح لے لیا، شیفتہ داغ کے ہمعصر اور عمر میں ان سے کچھ بڑے تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مصرع کسی مشاعرے کی طرح ہوگا، شیفتہ کا شعر یہ ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ   اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اس زمین میں اس زمانہ کے بعض اور شعراء کی غزلیں بھی موجود ہیں اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یقیناً یہ مصرع طرح کا ہوگا اور اس پر اس دور کے شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہونگی

غزل میں بھی یہ شعر لکھ دو ہے

گرتی ہے زیرِ بر قعِ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

جب میں شعر لکھ چکا تو بولے کہو شعر تمہارا اچھا رہا کہ ہمارا، میں نے عرض کیا استاد کا شعر بہت "روشن" ہے۔

۲۵ر اپریل سنہ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ وہ ریل میں سفر کر رہے تھے اتفاق سے اسی ریل میں ایک طوائف بھی سفر کر رہی تھی بڑی بنی ٹھنی بہت ٹھسّے کے ساتھ وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تھی، نخوت و غرور کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بڑے انداز سے بات کر رہی تھی، مرزا صاحب دیر تک اس کا یہ رنگ دیکھتے رہے طبیعت میں شوخی و شرارت ہمیشہ سے تھی، خصوصاً طوائفوں کے معاملہ میں وہ ہمیشہ دلچسپی لیا کرتے تھے، وہ طوائف داغ صاحب سے ناواقف تھی، لیکایک مرزا صاحب نے اس طوائف سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، طوائف نے کہا فرمائیے، مرزا صاحب بولے، تم سے ڈر لگتا ہے، طوائف بولی ڈرنے کی کیا بات ہے فرمائیے کیا بات ہے، مرزا صاحب بولے کہ اگر اجازت ہے تو عرض کرتا ہوں سے

مجھے کچھ تم سے کہنا ہے مگر میں تم سے ڈرتا ہوں
اجازت ہے تو کہتا ہوں کہ میں بھی تم پہ مرتا ہوں

اس بے محل بات پر طوائف نے ناک بھوں چڑھالی اور چاہتی تھی کہ کچھ بُرا بھلا کہے کہ ایک صاحب جو پاس بیٹھے تھے بولے کہ تمہیں نہیں معلوم یہ مرزا داغ ہیں، یہ سن کر طوائف دنگ رہ گئی اور کھڑی ہو گئی اور بڑے انکسار سے مرزا داغ سے معافی خواہ ہوئی، اس کے بعد تمام سفر خوشی خوشی گزر گیا۔

مرزا داغ نے آج رامپور کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دفعہ جلالی کے تلامذہ میں سے کسی نے مشاعرہ کیا، اس مشاعرے میں علاوہ مرزا صاحب کے منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی، مظفر علی خاں اسیر[1]، سید ضامن علی جلال[2]، امیر اللہ تسلیم[3]، سید محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی وغیرہ وغیرہ

---

[1] سید مظفر علی نام اور اسیر تخلص تھا، امیٹھی وطن تھا جو لکھنؤ کے مضافات کا مشہور قصبہ ہے، والد کا نام سید مدد علی تھا، نصیر الدین حیدر کے یہاں صدر امین اور امجد علی شاہ کے زمانے میں وزارت عالیہ کے میر منشی مقرر ہوئے سلطنت اودھ کا جب انتزاع ہوا تو رام پور پہنچے اور معزز ہوئے، مصحفی کے شاگرد تھے ۱۸۸۲ء کو بعمر ۸۲ سال لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔

[2] حکیم ضامن علی جلال حکیم اصغر علی خاں کے صاحبزادے تھے اور لکھنؤ کے خاص باشندے تھے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء میں وفات پائی، شاعری میں امیر علی ہلال اور میر اوسط علی رشک کو کلام دکھایا عرصے تک رام پور ریاست سے وابستہ رہے اسکے بعد منگرول کے دربار سے وابستہ ہو گئے آخر زمانہ لکھنؤ (باقی صفحہ ۸۱ پر)

شامل تھے، جب میری باری آئی اور میں نے غزل شروع کی تو مشاعرے میں داد کا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا، بعض شعراء نے تو اپنی غزلیں پھاڑ کر میرے آگے ڈھیر کر دیں، میں حیران اور اپنی مقبولیت اور خدا کے فضل و کرم پر حد درجہ شاداں و فرحاں تھا میری غزل کا مطلع کم از کم ۲۰ یا ۲۵ مرتبہ پڑھوایا گیا لیکن لوگ کسی طرح سیر نہ ہوتے تھے، مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے تو یاد نہیں کہ اس مطلع پر مجھے جسقدر داد ملی اتنی کسی اور مطلع پر کبھی داد ملی ہو، مطلع یہ ہے ؎

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

(بقیہ صفحہ) میں بسر ہوا، جلال بڑے باکمال تھے عروض و فنِ تحقیق کے امام تھے لیکن "ہمچو من دیگرے نیست" کے غرور نے انکو ہمیشہ پریشان رکھا اور انکی حسب ضرورت قدر نہ ہو سکی

سے احمد حسین نام تھا امیر اللہ عرف اور تسلیم تخلص کرتے تھے ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے مولوی عبد الصمد انصاری کے بیٹے تھے موضع منگلسی نواح فیض آباد وطن تھا، عرصے تک نولکشور پریس میں ملازم رہے، نواب اصغر علی خاں نسیم سے شاعری میں اصلاح لیا کرتے تھے، نواب کلب علی خاں نے علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کو اپنے یہاں بلا لیا اور مطبع سرکاری آپ کے سپرد ہوا، کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی مدارس ہو گئے، بڑے طباع اور مشاق شاعر تھے آپ کے شاگردوں میں حسرت موہانی، عرش گیاوی اور اصغر گونڈوی نے خاص شہرت حاصل کی

یکم مئی ۱۹۰۰ء

مرزا صاحب کو تنہائی مطلق پسند نہیں ہے اول تو ہر وقت احباب اور شاگردوں کا اجتماع رہتا ہے لیکن اگر کسی وقت وہ خالی ہوتے ہیں تو بھی اپنی زندہ دلی و خوش مذاقی کے لئے کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیا کرتے ہیں، دو تین نو عمر لڑکیاں مرزا صاحب کی پروردہ ہیں، خالی اوقات میں ان سے باتیں کر کے دل بہلاتے ہیں کبھی ان میں سے کسی سے کہتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھ سے شادی کر لوں، بول مجھ سے شادی کرے گی وہ کمسن بچی مرزا صاحب کے اس فرمانے پر مسکرا کر جواب دیتی کہ حضور آپ اپنی عمر دیکھیں اور مجھے دیکھیں، آپ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں اس عمر میں آپ شادی کر کے کیا کریں گے اور میں آپ سے شادی کر کے کیا لے لوں گی یہ کہہ کر معصومانہ انداز سے کہ، جیسے کسی نے یہ سب باتیں یاد کرا دی ہوں، مرزا صاحب کا یہ شعر پڑھتی ہے

حضرت داغ کا یہ سن شریف
اور پھر شوخ سیمبر کی تلاش

مرزا صاحب ان آٹھ آٹھ نو نو برس کی لڑکیوں کی ان باتوں اور حاضر جوابیوں پر خوب ہنستے اور لطف اٹھاتے ہیں اور یہ شعر اکثر پڑھا کرتے ہیں ؎

ہر رنگ میں اب داغ سا ہم رنگ کہاں ہے
بڈھوں میں وہ بوڑھا ہے جوانوں میں جواں ہے

ان کم عمر لڑکیوں میں برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کا مادہ اور خوش گفتاری کے محاسن بھی مرزا صاحب کی ہر وقت کی صحبت سے پیدا ہو گئے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب کے گھر کا بچہ بچہ کسی نہ کسی حد تک ذوقِ شعر بھی رکھتا ہے، ان لڑکیوں کو مرزا صاحب کے سینکڑوں اشعار یاد ہیں معمولی ملازموں اور خدمتگاروں کو غزلیں کی غزلیں حفظ ہیں، صحت لفظی کا یہ عالم ہے کہ کیا مجال کوئی غلط لفظ زبان سے نکل جائے، جاہل ان پڑھ ملازموں کے بھی شین قاف درست ہیں۔

ایک مسلمان ساہوکار مرزا صاحب کے زیر سایہ رہتا ہے، دو سال سے وہ دیوالیہ ہو گیا ہے آج احسن فصیح اللغات کے لئے شالیہ اشعار لکھوا رہے تھے انہوں نے "بچت" کے لفظ کو نظم کرانا چاہا، مرزا صاحب بولے کہ ہم اپنے پڑوسی کا حال بیان کرتے ہیں، یہ کہکر برجستہ یہ شعر پڑھا

سودے میں جنس دل کے دوالا نکل گیا
بیوپار وہ کیا تھا کہ جس میں بچت نہ تھی

مرزا صاحب کے انتقال کی خبر تقریباً ہر سال اڑا کرتی ہے اور نہایت صبر و شکر کے ساتھ وہ ان اخبار کو سنا کرتے ہیں، اکثر ہنسکر کہتے ہیں کہ ہر سال مرنے کی خبر اڑنے سے اتنی ہی میری عمر بڑھ جاتی ہے، آج نواب میر حسن علیخاں ایک اخبار لائے اور مرزا صاحب کو دکھایا اس میں مرزا صاحب کے انتقال

کی خبر چھپی تھی، اس خبر کو سن کر سب لوگ ہنسنے لگے اور جو شخص ایسی خبریں اڑاتا ہے اس پر نفرین کرنے لگے، مرزا صاحب نے اس خبر سے پورا لطف اٹھایا اور برجستہ اپنا یہ شعر پڑھا ؎

الٰہی کیوں غمِ فرقت میں ہم مر مر کے جیتے ہیں
کہ دنیا میں تو کوئی مر کے پیدا ہو نہیں سکتا

اس شعر پر پوری غزل کہنے کی لوگوں نے فرمائش کی، اور مرزا صاحب نے کہا کہ بھائی اس پر فکر کل کریں گے، مجھے حکم ہوا کہ شعر نوٹ کر لیا جائے پھر مرزا صاحب بولے کہ شاید اس زمین میں مَیں غزل کہہ چکا ہوں۔

مرزا صاحب دردِ نقرس کے پرانے مریض ہیں، سینکڑوں علاج ہوتے ہیں لیکن اس موذی مرض سے نجات نہیں ملتی آج درد کی تکلیف میں بولے کہ ایک دوست نے مجھے بتایا ہے کہ اگر شہد کی مکھیوں سے مقام ماؤف کو کٹوایا جائے تو درد دور ہو جاتا ہے، اب یہی ایک علاج رہ گیا ہے وہ بھی کر کے دیکھوں گا۔

مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ میرے پاس بشیر خاں بشیر[1] رامپوری آئے، میں اس وقت بہت مصروف تھا میرا ایک ماتحت کچھ سرکاری کاغذ

[1] جناب نوح ناروی شاگرد داغ نے اپنے ایک مضمون میں یہ واقعہ مرزا مظفر حسین صاحب بارق سے متعلق لکھا ہے (دیکھئے نگار داغ نمبر)

ہوئے محکمے کے بعض معاملات کی رپورٹ سنا رہا تھا اور میں روئداد سن کر جگہ بہ جگہ اسے ہدایات کرتا جاتا تھا۔ دوسری طرف ایک شاگرد بیٹھے ہوئے اشعار لکھ رہے تھے گویا اس طرح بیک وقت شاعری بھی ہو رہی تھی اور سرکاری کام بھی جاری تھا۔ بشیر خاں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے بولے کہ حضرت یہ عجیب طریقہ ہے آپ ایسے موقع پر اشعار کیسے کہتے جاتے ہیں، مجھ سے تو تمام عمر شاعری اس طرح نہیں ہو سکتی، مرزا صاحب نے پوچھا کہ پھر آپ شاعری کس طرح کرتے ہیں، وہ بولے کہ میں تو اس طرح شاعری کرتا ہوں کہ حقہ بھروایا، سب سے علیحدہ کمرے میں پلنگ پر جا لیٹا، کسی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی، بار بار تازہ حقہ بھرواتا ہوں، جب کوئی مصرعہ موزوں نہیں ہوتا تو تڑپتا ہوں، بے چین ہوتا ہوں، پلنگ پر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا ہوں جب کہیں جا کر شعر مکمل ہوتا ہے، مرزا صاحب نے یہ سب سن کر فرمایا:۔

"تو پھر آپ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں"

۱۴ر جون سنہ ۱۹۰۰ء

آج مرزا صاحب بولے کہ میں جب بوجہ تنگیٔ خرچ حیدر آباد سے مایوس ہو کر دلّی چلا گیا تو وہاں پہنچکر ایک روز شب کو ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ ایک معمولی سا مکان ہے، بوریا بچھا ہوا ہے اور اس بوریئے پر بیٹھا ہوا میں ایک غزل تیار کر رہا ہوں، یکایک دو شخص نمودار

ہوئے، دونوں نے میرے بازو پکڑ لیے میں چونکا اور جب نظر اوپر اٹھی تو دیکھا کہ حضرت ذوق ہیں، دوسرے شخص کو میں نے نہیں پہچانا۔ میں حضرت کو دیکھ کر فوراً قدموں پر گرا، انہوں نے مجھے پیار سے اٹھایا اور دوسرے بزرگ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان سے ملو میں نے ان کو چونکہ نہیں دیکھا تھا، انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، نورانی چہرہ سفید لباس، میں نے بڑھ کر مصافحہ و معانقہ کیا، استاد بولے کہ پہچانا یہ کون ہیں، میں نے عرض کیا کہ حضور مجھے بتائیے، بولے میر حسن ہیں، یہ سنتے ہی میں ان کے بھی قدموں پر گرا انہوں نے میرا سر عجز اٹھایا، دوبارہ گلے سے لگایا اور فرمانے لگے کہ تو اتنا پریشان کیوں ہے ایک بڑا رئیس بہت جلد تیری سرپرستی کرنے والا ہے، وہاں لوگ تیرا انتظار کر رہے ہیں، اس قدر دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی، اتفاق ملاحظہ ہو دوسرے روز میرے پاس حیدرآباد سے خط آیا جس میں میری طلبی تھی، اس تائید غیبی نے حیدرآباد کے دوبارہ سفر پر آمادہ کیا اور میں چلا آیا اور آج یہاں مجھے جو کچھ کامیابی نصیب ہے وہ سب انہیں بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے،

[1]

آج مرزا صاحب نے ایک یہ واقعہ سنایا کہ وہ ایک دفعہ بھاگیرتھی میں ڈوبتے ڈوبتے بچے، انہوں نے فرمایا کہ ایک ڈونگے میں ہم اور

[1] اصل مسودہ میں اس مقام کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے، نہیں (باقی صفحہ پر)

ہمارے دوست عبدالاحد اور حافظ محمد ابراہیم سوار تھے ہم تینوں آدمی بہ اعتبار تن و توش ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے، ڈونگے کو چلانے والا صرف ایک تھا، اتفاقاً دوسری طرف سے ایک اسٹیمر آیا وہ جب ہماری کشتی سے صرف ۵ گز کے فاصلے پر رہ گیا تو اس کے دباؤ سے جو پانی کٹا اس نے ہمارے ڈونگے کی رفتار پر اثر کیا پانی کی لہروں نے ڈونگے کو ڈانوا ڈول کر دیا، وہ کبھی ایک طرف اونچا ہو جاتا کبھی دوسری طرف ہم تینوں کی بری حالت تھی، حافظ ابراہیم نے حزب البحر پڑھنا شروع کر دی، وہ نہایت بدآواز تھے خوف و دہشت نے ان کی آواز کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا تھا، مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی عبدالاحد مجھ پر خفا ہونے لگے، بولے یہاں جان پر بنی ہے آپکو مذاق سوجھا ہے میں نے ہنس کر کہا کہ بھائی موت تو اب ضرور آئی ہے، ہنسنے اور تفریح لینے کی حسرت کیوں دل میں رہے جائیں یہ کہہ کر میں نے حافظ ابراہیم سے کہا کہ ذرا زور سے اور چلا چلا کر پڑھو تاکہ جلد نجات ہو جائے

بعد مغرب حسب معمول محفل آراستہ تھی، روزانہ کے حاضر باش جمع تھے کہ یکایک ایک صاحب تشریف لائے، السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے، دیر تک

(بقیہ صفحہ) کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ کس زمانہ کا ہے اور کس مقام کا ہے، مرزا صاحب کے دوست عبدالاحد اور حافظ محمد ابراہیم کون تھے، ان کے متعلق بھی مولانا احسن مارہروی مرحوم نے کوئی تشریح نہیں کی ہے۔

انہوں نے کوئی بات چیت نہیں کی، ہم لوگ ان سے واقف نہیں تھے، نواب حسن علی خاں نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ آپ سے ملئے، ہم لوگ ادھر مخاطب ہوئے تو بولے کہ یہ ایک احمق آدمی ہیں انہوں نے بولنا بالکل ترک کردیا ہے اور وہ بھی اس اندیشے کی بنا پر کہ کوئی بے محل بات زبان سے نہ نکل جائے، مرزا صاحب نے یہ تقریر سن کر فرمایا کہ کم سخنی تو عقلمندی کی دلیل ہے اگر یہ کم بولتے ہیں تو بڑا اچھا کرتے ہیں مرزا صاحب کے اس ارشاد پر وہ نووارد فوراً بول اٹھے کہ جناب میں احمق نہیں ہوں، خوب بولتا ہوں، اور اگر آپ فرمائیں تو بولوں اور مسلسل بولتا رہوں اور آپ کو بتاؤں کہ انگریزوں نے جو یہ تمام ہندوستان میں ریلوں کا جال پھیلا دیا ہے اس کی اصل وجہ کیا ہے، انگریز چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مشہور مشہور عمارتیں مثلاً آگرے کا تاج محل، دہلی کی جامع مسجد اور قطب مینار آگرے، و دہلی کے قلعے جو دنیا کی نادر چیزیں ہیں اندھیری رات میں ریلوں پر لاد کر ولایت لے جائیں اور اس منتقلی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے وغیرہ وغیرہ بڑی دیر تک وہ حضرت بولتے رہے، حاضرین کی ہنسی اور قہقہوں نے انہیں برافروختہ کردیا اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ آپ سب نہایت بد مذاق ہیں اور میں ایسے بد مذاقوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند نہیں کرسکتا، اٹھ کر چل دیئے، انکے اٹھ جانے کے بعد مرزا صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

مرزا صاحب کی زندگی بڑی مطمئن گزرتی ہے خدا نے ہر طرح آرام و آسائش دے رکھی ہے اور ہر طرح مرزا صاحب آسودہ و خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں، رات دن احباب و شاگردوں کا مجمع رہتا ہے اندر و باہر مرزا صاحب کے متعدد ملازم و خدمت گار موجود رہتے ہیں، علاوہ ایسے ملازموں کے جو آئے دن رکھے اور نکالے جاتے ہیں، کچھ مستقل اور قدیم ملازم بھی ہیں جن میں عبدالحمید محبوب الاجنا، بڑے اور چھوٹے جمال، منشی عبدالغنی دیوان عبدالعزیز تحویلدار، غلام رسول کاتب اور رحمت اللہ قوال کو خاص خصوصیت حاصل ہے، مرزا صاحب کے باورچی خانے کے ملازموں میں انا لطیفن، سجن، چمپا، اور صاحب جان پرانی ملازم ہیں، الغرض مرزا صاحب کا شمار ہر اعتبار سے یہاں کے امرار و رؤسا میں ہوتا ہے۔

مرزا صاحب کبھی کبھی بڑی پر حسرت آواز میں میر کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں آج میں جس وقت پہونچا وہ یہی شعر پڑھ رہے تھے ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء

آج صبح جس وقت میں پہونچا مرزا صاحب خضاب لگوا رہے تھے، ہر تیسرے روز خضاب لگتا ہے، مجھے دیکھ کر ہنسے اور یہ شعر پڑھا ؎

دشمن زندگی است موئے سفید
روئے دشمن سیاہ باید کرد

خضاب لگانے کی ڈیوٹی جمال نامی ملازم کی ہے ویسے یہ کام اور ملازموں سے بھی لیا کرتے ہیں لیکن جمال کو اس میں پوری پوری مہارت حاصل ہے، داڑھی اور سر دونوں پر خضاب لگتا ہے، ڈاڑھی چڑھا کر ڈھاٹا باندھا جاتا ہے میں خیریت مزاج پوچھ کر چپ بیٹھ گیا تو مرزا صاحب بولے کہ سید گو عمر میری کافی ہو گئی ہے اکثر جذبات سرد ہو گئے ہیں لیکن ابھی بالکل فنا نہیں ہوئے ہیں، احساس باقی ہے، سفید بالوں کو دیکھ کر احساسِ کہولت پیدا ہوتا ہے، خضاب لگ جانے سے نظر دھوکا کھاتی ہے اور یہ احساس کم ہو جاتا ہے، جوانی میں سیاہ بال دیکھ کر دل جوش اور ولولوں سے بھر جاتا تھا، اگر تمدن و تہذیب اجازت دیتی تو میں اس عمر میں داڑھی منڈوانا شروع کر دیتا اس سے جہاں خضاب لگوانے کی صبر آزمائی سے نجات مل جاتی وہیں کچھ مدت کیلئے سفید بال نگاہوں سے دور ہو جاتے اور کسی حد تک یہ احساس بھی ختم ہو جاتا کہ خضاب لگا کر سفید بالوں کو سیاہ کیا گیا ہے۔

شب کی نشست میں مرزا صاحب حسبِ معمول حقہ پیتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے اتفاق سے ایک انگارہ چلم سے اڑ کر فرش پر جا گرا میں نے جلدی سے اٹھ کر اس آگ کے انگارے کو پیر سے ایک طرف کر دیا

حسن علی خاں امیر ہنسکر بولے دیکھو فرش میں داغ لگ گیا، مرزا صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ معاف فرمائیے یہ خاکسار کی ہمیشہ سے عادت ہے' سب لوگ ہنسنے لگے۔

اس واقعہ کے بعد مرزا صاحب بولے کہ ایک دفعہ رام پور کی ملازمت کے دوران لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا اس زمانے میں لکھنؤ میں مشتری طوائف کی بڑی دھوم تھی، گانے کی مہارت کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہتی تھی بہادر حسین خاں انجم اور ہم مشتری کے یہاں پہونچے بڑی تعظیم و تکریم سے ہم لوگوں کو اس نے بٹھایا کچھ دیر کے بعد مشتری نے مجھ سے فرمائش کی کہ دو ایک غزلیں سنا دیجئے، میں نے غزل سنائی' مجھے خوب یاد ہے کہ میرے اس شعر پر ؎

شب ہجر اُن کے جاگنے والے
ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

مشتری بے خود ہوگئی، دیر تک بے خودی کا عالم اس پر طاری رہا، بار بار شعر پڑھتی تھی اور وجد کرتی تھی، کچھ دیر کے بعد میں نے مشتری سے کلام سنانے کے لئے کہا وہ بیاض لینے کے لئے دوسرے کمرے میں گئی، حقہ بھرا ہوا سامنے رکھا تھا، ایک صاحب کی حماقت سے چلم فرش پر گر پڑی، ملازم جلدی جلدی فرش سے انگارے اٹھانے لگا لیکن پھر بھی کئی جگہ سے چاندنی جل گئی، مشتری جب بیاض لے کر پہونچی تو اس نے پوچھا کہ کیا ہوا میں نے جواب دیا کہ " داغ لگ گیا " مشتری بڑی حاضر جواب تھی برجستہ بولی۔

"مگر مشتری پھر بھی بے داغ رہی ــــ"

آج مرزا صاحب کے اس شعر پر کہ ؎

آنکھ پھرتی ہے تیری لیل و نہار
ہے اسے گردش ایام کی حرص

بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، مرزا صاحب خاموش اس بحث کو سنتے رہے بحث یہ تھی کہ معشوق صبح و شام جو رنگ بدلتا ہے اور بے مروتی کرتا ہے درحقیقت وہ گردشِ ایام کی حرص میں کرتا ہے، جس طرح انسان گردشِ ایام سے پریشان رہتا ہے اسی طرح عاشق معشوق کی رات دن کی بے مروتی سے پریشان رہتا ہے شاعر نے آنکھ کی گردش کو گردشِ ایام سے تشبیہہ دی ہے، بڑی دیر تک حاضرین اس شعر کی تشریح کرتے رہے اور ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس شعر کی وضاحت کرتا رہا، جب کافی دیر بحث کو ہو گئی تو مرزا صاحب بولے کہ اس مفہوم کو جو میں نے اس شعر میں پیدا کیا ہے ذرا سی تبدیلی مگر بہترین تبدیلی کے ساتھ ایک فارسی شاعر نے نظم کیا ہے، سنئے اور لطف اٹھایئے ؎

با ما بگردشے چہ کند روزگارہا
ما دیدہ ایم گردشِ چشمِ تو بارہا

اس شعر کو سن کر سارے مجمع میں ایک کیفیت سی پیدا ہو گئی، ہر شخص نے لطف لیا، مرزا صاحب بولے، لاکھ کوشش کریئے لیکن اردو میں وہ قوتِ

بیان پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کیلئے مخصوص ہے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے اس شعر میں جو شاعر نے مضمون باندھا ہے اسی تخیّل کا اظہار ایک ہزل گو شاعر نے اردو میں بھی کیا ہے، ملاحظہ کیجئے کیا بات پیدا کی ہے ؎

جس نے کھائے ہوں تیر مژگاں کے
اس کے آگے تو پھانس ہے بھالا

مرزا صاحب کی برجستہ مثالی پر حاضرین ہنسنے لگے اور بہت لطف آیا۔

۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

آج منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی کا انتقال ہو گیا، امیر کے انتقال کی خبر جب مرزا صاحب کو ملی تو وہ بے تاب ہو گئے، بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے، ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ ان کی زبان سے سب سے پہلی بات جو ادا ہوئی وہ یہ شعر تھا ؎

داغ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوٹی
ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

اسی وقت بعجلت تمام حضرت امیر مرحوم کی قیام گاہ کے لئے روانہ ہو گئے، امیر مرحوم مرزا داغ کے ہی طلبیدہ آخر ماہ جمادی الاول ۱۳۱۸ھ میں حیدر آباد پہونچے تھے اور ابھی چند ماہ ہی رہنے پائے تھے کہ انتقال فرما گئے۔

یکم مارچ سنہ ۱۹۰۱ء

آج بڑی دیر تک مرزا صاحب حیدرآباد کے بعض افراد کی بیجا مخالفتوں اور مخاصمتوں کا ذکر کرتے رہے انہوں نے فرمایا کہ ترکی[1] علی شاہ ترکی کو میرے ساتھ درپردہ خاص خصومت ہے، ظاہرا وہ میری مخالفت نہیں کر سکتے لیکن درپردہ وہ ریشہ دوانیوں سے ذرا نہیں چوکتے، ظہیر[2] کے اور میرے مراسم خصوصی ہیں لہذا ان کو کئی بار ذلیل کر چکے ہیں، فیض[3] صاحب کے

---

[1] ترکی علی پانی پت کے ایک قصبہ نور محل کے رہنے والے تھے اصل نام غلام میر تھا ترکی تخلص کرتے تھے، قلندریہ فرقے میں شامل ہو کر نام کے ساتھ قلندر کا اضافہ کر لیا فارسی کے بالغ نظر شاعر تھے، غلام قادر گرامی کے بہنوئی تھے، ریاست سے ۵۰ ماہوار وظیفہ بھی مقرر تھا، مہاراجہ کشن پرشاد کے مقربین میں سے تھے ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا

[2] سید ظہیر الدین نام اور ظہیر تخلص تھا، میر جلال الدین کے لڑکے تھے جو شاہ ظفر کے خوش نویسی میں استاد تھے غدر کے بعد خانہ برباد ہوئے اور والد اور بھائی کے ساتھ جابجا پھرے، رام پور، الور بھی رہے، کچھ دن بلند شہر میں اخبار جلوہ طور کے اڈیٹر بھی رہے اسکے بعد جے پور پہونچے اور محکمۂ پولیس میں ملازم ہو گئے اور ۲۰ برس تک وہاں رہے، وہاں سے کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا تو دہلی چلے آئے، آخر عمر میں حیدرآباد پہونچے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے وابستگان میں شامل ہو گئے سنہ ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا

[3] حافظ شمس الدین نام کے ایک بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے سنہ ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے بچپن میں حیدرآباد پہونچے یہیں تعلیم و تربیت پائی بڑے اچھے شاعر تھے فیض تخلص کرتے تھے، شاعری کے ساتھ پیری مریدی بھی کرتے تھے سنہ ۱۲۶۳ھ میں انتقال فرمایا ان کے انتقال کے بعد انکے ایک شاگرد فیاض الدین فیاض نے ان کا عرس کرنا شروع کیا، اسی عرس میں سالانہ مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا اوپر اسی مشاعرہ کا ذکر ہے یہ مشاعرہ فیض صاحب کا مشاعرہ کہلاتا تھا جو فیاض کے انتقال کے بعد یعنی سال سنہ ۱۳۲۸ھ تک برابر جاری رہا

مشاعرے کا واقعہ بیان کیا کہ شمع ظہیر کے سامنے آئی وہ انکے آگے سے اٹھا کر جلیل شاگرد امیر مینائی کے آگے رکھدی گئی، ظہیر کو یہ کہاں برداشت، غزل چاک کرکے اٹھ کھڑے ہوئے، زمانہ اس قدر ناقدرشناس ہے کہ وہ اہل کمال کی حسب مراتب قدر نہیں کرتا، ظہیر جس پایہ کا شاعر ہے کوئی داغ کے دل سے پوچھے افسوس مفلسی اس بیچارے کے گلے کا ہار ہے، لیکن شرافت چمکے بغیر نہیں رہتی وہ اس مفلسی میں بھی قناعت کی شان رکھتا ہے مرزا صاحب بولے کہ مجھے اپنے ساتھیوں میں جس قدر عزت ظہیر کی مدنظر ہے کسی کی نہیں مگر افسوس زمانہ ایسے جوہر قابل کا قدردان نہیں، بڑی دیر تک مرزا صاحب افسوس کرتے رہے۔

***

۳ مارچ ۱۹۰۱ء

آج کی صحبت میں نواب میر حسن علی خاں، امیر، میر مردان علی[1]، اسید علی حسن منشی نصیر الدین[2] اور راقم (مولوی افتخار عالم) حاضر تھے، احسن فصیح اللغات

---

[1] محکمۂ صدر محاسبی میں منتظم تھے، آخر میں شاید مددگار بھی ہو گئے، میر حسن علی خاں ادہ گراہی کی پارٹی کے آدمی تھے علیا میاں کے بازار میں رہتے تھے شاعر نہ تھے مگر صاحب ذوق اور سخن شناس تھے۔ بڑے خلیق ملنسار اور وضعدار انسان تھے مرزا داغ کے روزمرہ کے حاضر باشوں میں سے تھے۔

[2] منشی نصیر الدین غالباً داغ کے حاضر باش شاگردوں میں سے ہی کوئی صاحب تھے، ان کا تفصیلی حال معلوم نہ ہو سکا۔

کے لئے مثالیہ اشعار کہلوا رہے تھے، علیحدہ ایک کاغذ پر احسن اور مرزا صاحب کے دیوان کے مسودے پر یہ اشعار میں لکھتا جا رہا تھا، یکایک مرزا صاحب نے سوال کیا کہ بھائی ہمارے یاروں اور شاگردوں میں کوئی "لونڈے باز" بھی ہے. یہ جملہ سن کر جلسے کا جلسہ حیران ہو کر مرزا صاحب کا منہ تکنے لگا اور سوچنے لگا کہ مرزا صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں ـــــ سب کو خاموش دیکھ کر مرزا صاحب بولے کہ بھائی ہے ضرور یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنا نام نہ بتائے، میر مردان علی نے پوچھا کہ حضرت بات تو بتائیے یہ کیوں پوچھا جا رہا ہے، بولے مجھے ایک لونڈا ملازم رکھنے کی ضرورت ہے، آجکل مہمان زیادہ آ گئے ہیں اور میرے سب ملازم مہمانوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، یہ سن کر نواب حسن علی خاں بولے کہ میں آپ کو ایک لونڈا لا دوں گا، ان کا یہ فرمانا تھا کہ سارا جلسے کا جلسہ ہنس پڑا مرزا صاحب نے بھی ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولے کہ کیوں صاحبو میں نہ کہتا تھا کہ میرے شاگردوں اور احباب میں کوئی لونڈے باز ضرور ہے۔

****

آج شب کی نشست میں رام پور کے پٹھان ممتاز علی خاں[1] نے جو عبدالقادر خاں کے بیٹے ہیں مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت میں نے بارہا چاہا کہ اس قدرت کا اندازہ کروں کہ آپ گھنٹے بھر میں کتنے شعر کہتے ہیں لیکن آج تک اس کا عملی تجربہ نہ ہو سکا، مرزا صاحب بولے

[1] ممتاز علی خاں داغ کے بڑے مخلص شاگردوں میں سے تھے، انکا حال مفصل معلوم نہ ہو سکا

کہ بھائی مجھے کیوں آزماتے ہو ویسے اگر تمہارا دل چاہتا ہو تو مصرع دو اور قدرت کا ابھی ابھی اندازہ کر لو۔ ممتاز علی خاں نے یہ مصرع دیا ع

تیر ہیں تیری ادائیں سب کی سب

استاد نے ادھر مصرع ممتاز علی کی زبان سے سنا ادھر یوں گرہ دی ع

عشوہ ہو یا غمزہ ہو یا ناز ہو
تیر ہیں تیری ادائیں سب کی سب

یہ شعر فرما کر مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔ ۱۵ منٹ میں بیس اشعار کی ایک مرصع غزل کہہ کر مرزا صاحب ممتاز علی خاں سے بولے کہ کہو اندازہ ہوا یا کچھ اور فکر کروں، ممتاز علی خاں حیران تھے، بولے کہ ٹھیک ہے، جیسا سنا ویسا ہی آپ کو پایا۔

آج میرٹھ کی ایک طوائف مرزا صاحب سے ملنے کے لئے آئی، گو ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن تندرستی اتنی اچھی تھی کہ نو عمر معلوم ہوتی تھی، زہرا جان نام بتایا، مرزا صاحب نے اس کے اشتیاق پر اپنے دیوان کی ایک مطبوعہ جلد اسے دی، زہرا جان قریب ایک گھنٹہ بیٹھی، مرزا صاحب بڑے مزے مزے کی اس سے باتیں کرتے رہے، میر حسن علی خاں جو موجود تھے بولے کہ تمہیں مرزا صاحب کا کچھ کلام بھی یاد ہے، زہرا جان نے کہا کہ اگر آپ سنیں تو سناؤں، نواب صاحب بولے ضرور ضرور، زہرا جان نے مرزا صاحب کی یہ غزل سنائی :-

بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں | ہم بھی دیکھیں تو اسے دیکھ کے کیا کہتے ہیں
چوٹ کھانے سے جو دل ٹوٹ گیا ہے اپنا | لوگ اس کو بھی ترا عہد وفا کہتے ہیں
شکوۂ ہجر پہ اس شوخ نے مجکو لکھا | جو رہے دل میں، کہیں اسکو جدا کہتے ہیں
دعویٰ مہر و وفا ان کی زباں پر آیا | اور سنئے کہ وہ میرا ہی کہا کہتے ہیں

پہلے تو داغ کی تعریف ہوا کرتی تھی
اب خدا جانے وہ کیوں اسکو برا کہتے ہیں

غزل ختم ہوئی تو مرزا صاحب بولے کہ گو تم نے بغیر ساز کے گانا سنایا مگر اندازہ ہوا کہ اچھا گاتی ہو، کب تک یہاں قیام رہے گا، زہرا نے بتایا کہ ابھی ہفتہ عشرہ اور رکوں گی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ کسی روز فرصت ہو تو اپنا گانا سناؤ، زہرا نے کہا کہ جس روز آپ کا حکم ہو حاضر ہو جاؤں۔

مرزا صاحب بولے کہ جب انسان قریب المرگ ہوتا ہے تو اسے اپنے مرنے کے وقت کا احساس ہو جاتا ہے، میری اہلیہ مرحومہ پر جب مرض نے زیادہ غلبہ کیا تو یقین ہو گیا کہ اب خاتمہ جلد ہونے والا ہے، مرحومہ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آج کون دن ہے، پیر کا دن تھا کہنے لگیں کہ ابھی دیر ہے اسی طرح پنجشنبہ تک برابر پوچھتی رہیں، آخر جس روز پنجشنبہ تھا اس روز فرمایا کہ الحمدللہ اب مشکل آسان ہوئی، کوئی کچھ نہ سمجھا، مرحومہ نے پنجشنبہ کا دن گزار کر شب کو ایک بجے انتقال کیا اور اس طرح یہ یقین دلایا کہ انسان کو مرض الموت میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کب اور کس

وقت اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہے۔

٭٭٭٭٭٭

آج کی آمدہ غزلوں میں ایک غزل سید محمد عسکری نیاز مظفر نگری کی بھی تھی جب اس کی اصلاح کا نمبر آیا اور میں اس شعر پر پہنچا کہ ؎

سن کر چمن میں زمزمہ پروازیاں مری
نغمے کرے تو مرغ خوش الحاں مری طرح

شعر سن کر مرزا صاحب ہنسے فرمایا کہ اس شعر کے حاشیہ پر لکھ دو کہ "تم کون جانور ہو جو چمن میں زمزمہ پروازیاں کرتے ہو"

٭٭٭٭

۱۷/مارچ ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب شہ سواری کے ماہر ہیں، لڑکپن سے انہیں اس کا شوق ہے، رام پور میں انہیں جو ملازمت ملی وہ بھی طبیعت کی مناسبت سے ملی نواب صاحب کا اصطبل انکی نگرانی اور ان کے انتظام میں تھا اور اسطرح دوران ملازمت بھی انہیں گھوڑے کی سواری میں مہارت حاصل کرنیکے مواقع حاصل رہے، فرماتے ہیں کہ میں اپنی تمام عمر میں صرف ایک دفعہ گھوڑے سے گرا ہوں ورنہ اس کے علاوہ جب کبھی گھوڑے سے گرا مع گھوڑے کے گرا خود کبھی زمین پر نہیں آیا۔ مجھے ایک دفعہ اپنا جسم دکھایا

---

(۱) سید محمد عسکری، مظفر نگر کے رئیسوں میں سے تھے اور داغ سے فیض تلمذ تھا ذریعہ خط و کتابت شاگرد ہوئے تھے، داغ سے بڑی خصوصیت رکھتے تھے،

جس پر چند بھرے ہوئے زخم تھے فرمایا کہ گھوڑے کی سواری میں میرا بدن چور چور ہو گیا ہے۔

مرزا صاحب آجکل ایک نئی جوڑی گھوڑوں کی خریدنے کی فکر میں ہیں، آج صبح ایک جوڑی حاضر کی گئی، مرزا صاحب نے اسے ملاحظہ فرمایا اور حکم دیا کہ شام کو لایا جائے تاکہ سواری لے کر بھی ان کے عیب و ہنر کا اندازہ کیا جا سکے، سائل صاحب جو اس وقت موجود تھے بولے کہ چچا جان تین گھوڑے اس وقت بھی آپ کے پاس موجود ہیں اور تھان پر بندھے بندھے خراب ہو رہے ہیں ان میں مزید اضافہ آخر کیوں فرمایا جا رہا ہے، مرزا صاحب بولے کہ بھائی میں کیا کروں جب میری ٹانگ لنگڑانے لگی، سواری چھوڑ دی تو کیا اب یہ شوق بھی چھوڑ دوں کم از کم ان گھوڑوں کو تھان پر بندھا ہوا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیا کرتا ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ دلی میں جو بدمعاش گھوڑا ہوتا تھا، وہ میرے پاس بھیجا جاتا تھا۔ ایک دفعہ بطور آزمائش میرے پاس ایک گھوڑا بڑا حرامزادہ، آٹھوں گانٹھ کمیت ایک دوست نے بھیجدیا، اور فرمائش کی کہ اس گھوڑے کی مزاج پرسی کروں عید کے چار روز باقی تھے اس گھوڑے کو میں نے چار روز تک مکان پر رکھا اور دل میں طے کر لیا کہ عید کے روز اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملنے اس گھوڑے پر بیٹھ کر جاؤں گا۔ عید آئی، عیدگاہ میں نماز پڑھی گھر آئے، عید کی سوئیاں کھائیں اور وہی گھوڑا تیار کروایا، سب سے

پہلے بخشی صاحب سے ملنے گیا، گھوڑا اتنا حرام زادہ تھا کہ رکاب میں پاؤں رکھتے رکھتے اس نے موزہ منہ میں دے لیا لیکن کسی نہ کسی صورت میں سوار ہو گیا۔ سوار ہوتے ہی اس نے اس قدر دق کیا کہ میں حیران ہو گیا، گھوڑا کبھی الف ہو جاتا تو کبھی پشتک دیتا، کبھی موزے پہ منہ مارتا تو کبھی ایک جگہ اڑ جاتا، مجھے غصہ آ گیا، گھوڑے کو اس قدر مارا کہ وہ لہو لہان ہو گیا۔ بخشی صاحب کے یہاں پہونچا وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہنے لگے کہ بھائی تمہاری یہ کیا حالت ہے کیا کسی کا خون کر کے آئے ہو، میں نے سارا قصہ بیان کیا، آدمی گھر بھیجکر دوسرے کپڑے منگوائے اور کپڑے بدل کر اسی گھوڑے پر بیٹھ کر اور لوگوں سے عید ملنے گیا اور اسی گھوڑے پر واپس گھر پہنچا، اس گھوڑے نے مجھے تین دفعہ گرانا چاہا، لیکن تینوں دفعہ میں گھوڑے کے ساتھ ہی گرا۔

مرزا صاحب نے فرمایا کہ شہ سواری میں دہلی کے مشہور اور شاہی چابک سواران بجن خاں اور بندو خاں میرے استاد تھے اور انہوں نے مجھے گھوڑے کی سواری میں طاق کر دیا تھا۔

---

۱۸ مارچ ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب نے آج فرمایا کہ میں نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں استاد کے ساتھ شریک ہوا۔ "آسمان کے لئے" قافیہ و ردیف میں مشاعرہ تھا، مجھے حضرت ذوق سے پہلے اور جناب مومن کے بعد غزل

پڑھنے کا موقع ملا، ذوق استاد شاہ تھے اس لئے مشاعرے میں آخری غزل انہیں کی ہوتی تھی، مشاعرہ کچھ افسردہ و بے کیف سا ہو رہا تھا، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اساتذہ تک نے اس طرح میں زیادہ کوشش و کاوش نہیں کی تھی، مومن جیسے قادر الکلام شاعر کے کلام سے بھی مشاعرہ بیدار نہیں ہوا مومن کے بعد جب میری باری آئی تو رنگ محفل دیکھ کر مجھے طرحی غزل پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور غزل نہ کہہ سکنے کا عذر کر کے بے طرح غزل پڑھنے کی اجازت چاہی استاد نے اجازت دی اور میں نے غزل شروع کی میرے اس مطلع پر ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

مشاعرہ جو دیر سے سنسان و فسردہ تھا یک بیک بیدار ہو گیا اور مجمع میں ایک سنسنی سی پھیل گئی اور ساری محفل چمک اٹھی۔ اساتذہ تک نے میرے اس مطلع کی جھوم جھوم کر داد دی اور ہر شعر پر میرا دل بڑھایا، مرزا صاحب بولے اس زمانۂ نو عمری میں اساتذہ کی ذرا سی داد دینے سے دل کو اس قدر فرحت حاصل ہوتی تھی اور اس قدر ہمت افزائی ہوتی تھی کہ رات دن فکر سخن میں غلطاں و پیچاں رہا کرتا تھا اور یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک سے ایک بہتر شعر کہا جائے، اور اس عمل درآمد سے مہارت سخن میں معتد بہ اضافہ ہوا کرتا تھا۔

۱۹ر مارچ سنہ ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب بڑی دیر تک آج اپنی شاعری سے متعلق قصے بیان کرتے رہے، انہوں نے فرمایا کہ پہلے پہل میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے میں شریک ہوا، استاد ذوق، حضرت مومن اور نجم الدولہ مرزا غالب کے علاوہ اس وقت کے تمام مشہور شعرا، شریک مشاعرہ تھے اس موقعہ پر میں نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

اس مشاعرے میں غزل پڑھنے کے بعد تو پھر یہ حالت ہو گئی کہ جہاں کہیں مشاعرے کا حال سنتا وہیں پہنچتا، ایک دفعہ محلہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا، گیسو اپنا، جادو اپنا، قافیہ و ردیف میں مصرع دیا گیا، مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا میں بھی غزل کہہ کر گیا جب میں نے یہ مقطع پڑھا کہ ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجکو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

حضرت صہبائی آخر میں صد آفریں کہتے ہوئے اٹھے اور مجھے گلے سے لگا لیا اور بڑی تعریف فرمائی نواب اصغر علی خاں نسیم، شاگرد رشید حضرت مومن اور شاہزادہ مرزا صابر کے مشاعروں میں برابر شرکت رہا کرتی تھی اور عموماً ہر مشاعرے میں سننے والوں سے داد سخن لیتا تھا صہبائی

آرزو اور غالب جیسے باکمال استاد اور سخن ور میرے کلام کی روانی اور طبیعت کی جولانی کی تعریف کر کرکے میرا دل بڑھایا کرتے تھے، مرزا غالب میرے ان اشعار کو اکثر پڑھتے اور داد دیا کرتے تھے:-

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر　　دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو　　گویا زمیں پہ سایۂ مرغ طپیدہ ہوں

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں　　ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

۱۷ر جولائی ۱۹۰۱ء

آج کی ڈاک میں ایک خط منی بائی حجاب کا بھی تھا، میں نے لفافہ پہچان کر پیش کیا، مرزا صاحب نے اسے کھولا، پڑھا اور پڑھ کر مجھے دیدیا۔ میں نے عرض کیا کہ کیا جواب لکھا جائے گا۔ فرمایا ابھی اسے رکھئے پھر جواب لکھا جائے گا۔ حجاب کا خط یہ تھا:-

حاجی صاحب! السلام علیکم، بعد شوق ملاقات عرض پرداز ہوں کہ آپ کا محبت سے لبریز خط ملا، آپ بلائیں اور میں نہ آؤں میری کہاں مجال اور مجھ میں کہاں اتنی طاقت کہ غلط عذر کر سکوں مگر بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا، میں لاکھ چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں کے جھمیلوں سے نجات ملے اور میرے پر لگ جائیں اور آپ تک پہنچ لوں، مگر ان مجبوریوں کا خدا بھلا کرے کہ وہ ایسی میری روانگی میں

حائل ہیں کہ کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی، آپ ہیں کہ برابر بے مروتی و بے رخی کے طعن و تشنیع سے میرے دل کو چھلنی کئے ڈالتے ہیں، میرے ہر عذر کو بہانا خیال کر کے شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں. واقعات جو ہیں وہ من و عن، خود میں نیز حکیم صاحب آپ کو لکھ چکے ہیں، میں ان کا بار بار کیا ذکر کروں، آپ کی عقل کہاں گئی ہے، آپ کی ہوشمندی کدھر سو رہی ہے، سوچ سمجھ کر ضد کی جاتی ہے ——— اچھا جبر سے کام لیجئے وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ آپ میرے اور میں آپ کے سامنے ہونگی۔

آج دو روز سے مجھے زکام شدید ہو گیا ہے، ناک بری طرح بہتی ہے یہ خط مشکل سے لکھ پایا ہے، یقین ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہونگے. آپ یہ کیا لکھ دیا کرتے ہیں کہ "بجز غم فراق" کے سب خیریت ہے، مجھے آپ نے ایک دفعہ بھی نہیں لکھا کہ یہ درد نقرس کے بار بار دورے کیا معنی رکھتے ہیں. حکیم صاحب کے نام والے خط سے مجھے حال معلوم ہوا، خدا کرے کہ آپ اب بالکل صحیح ہوں. یہاں سب خیریت ہے، پرسانِ حال کی خدمت میں سلام۔

آپ کی "منی"

۸ رجولائی ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب نے فرمایا کہ زمانے کے الٹ پھیر ملاحظہ کیجئے کہ ہمارے

استاد حضرتِ ذوق کو چندو لال مدار المہام حیدرآباد دکن نے بڑے شوق سے بلایا، کئی ہزار روپیہ اور مصرعِ طرح کا بھیجا، حضرت نے مصرعِ طرح میں دو غزلہ کہہ کر تو بھیجدیا لیکن روپیہ نہیں لیا، محمد حسین آزاد نے ایک روز حضرت ذوق سے حیدرآباد نہ جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پتھر اپنی جگہ ہی بھاری ہے، میاں وہاں جاتے خدا جانے کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا، اپنی دلّی اور دلّی کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے جو اس پر خدا کا شکر نہ کیا جائے، یہ کہہ کر برجستہ یہ شعر پڑھا

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ہمارے استاد تو بلانے پر بھی حیدرآباد نہ آئے لیکن ہم ان کے نام لیوا بن بلائے حیدرآباد آدھمکے، کچھ دن رہے مایوس ہو کر واپس ہوئے اعلیحضرت نے یاد کیا، امید بھر آئی، استاد کی کسر شاگرد نے پوری کر دی، سچ ہے۔ ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

یہاں آئے تو ایسے مالامال ہوئے کہ شاعروں اور ہم چشموں میں آج ہمارا سر اونچا ہے۔ اور ہماری جیسی دوسری مثال شاعروں میں نہیں ہے۔

لے یہ شعر استاد ذوق نے چندو لال کو بھی لکھ کر بھیجا تھا۔

مرزا صاحب کو حفظِ مراتب کا بہت لحاظ رہتا ہے، اس سلسلہ میں وہ اتنے محتاط ہیں کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی علی القدر مراتب سلوک ہوتے ہیں، سادات کی تو بہت عزت کرتے ہیں، میں اگر کبھی اپنی سعادت سمجھ کر کوئی ان کا ایسا کام کر دیا کرتا ہوں جو معمولی نوکروں کا کام سمجھا جاتا ہے تو مجھے ایسا کرتے دیکھ کر بہت خفا ہوتے ہیں، آج ایک عجیب واقعہ ہوا، مغرب سے کچھ پہلے صحن مکان میں بیٹھے تھے، میں حاضر تھا، پیچوان سے منہ لگا ہوا تھا، سورت کو ایک خط لکھوایا اس کے بعد کہنے لگے کہ بھائی طبیعت گھبراتی ہے چلو باہر چل کر بیٹھیں، میں نے کہا، بہت خوب، اٹھ بیٹھے اور مجھ سے کہا چلو، جوتا پہننے لگے، اتفاق سے جوتے کی ایڑی دب گئی، میں جھک کر سیدھی کرنے لگا، جوتا اٹھا کر پھینک دیا اور خفا ہو کر کہنے لگے کہ کیا غضب کرتے ہو، کیا مجھے جہنم کا کندہ بناؤ گے تم کو نہیں معلوم کہ میں سیّدوں کا غلام در غلام ہوں، استغفراللہ ولاحول ولاقوۃ الاباللہ۔ ایک غل تھا، ایک شور تھا، میں ڈر گیا، میں نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا تو رنگ فق ہو گیا تھا، آدھ گھنٹے تک ان پر ایک عجیب صدمے کا عالم رہا۔

ــــــــــ

مرزا صاحب کو تلواروں کا بہت شوق ہے، کارنس پر دس پندرہ تلواریں احتیاط سے چنی ہوئی رکھی رہتی ہیں، ہر ہفتے ملازم ان کو اتار کر صاف کرتا ہے، ایک تلوار مرصع اعلیٰ حضرت حضور نظام نے عطا

فرمائی ہے۔ جو ہر وقت سرہانے رہا کرتی ہے اور وہ مرزا صاحب کو بہت عزیز ہے۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ تلوار چلانا، تیر اندازی کرنا، چو رنگ اور سپتا کاٹنا، بندوق چلانا مجھے ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے خود سکھایا تھا اور میں نے بڑی کوشش اور شغف سے ان تمام فنون میں مہارت حاصل کی تھی، تلوار چلانے میں خصوصیت کے ساتھ مجھے مہارت تھی، مگر افسوس اب یہ سب مہارتیں نام کی مہارتیں رہ گئی ہیں، صرف دل بہلانے کو ذکر باقی رہ گیا ہے۔

⁂⁂⁂

آج بارق نے کہا کہ مرزا صاحب آپ نے اپنا تخلّص بھی چھانٹ کر رکھا ہے، داغ کسی کا بھی تخلص نہیں ہے، مرزا بولے نہیں میر سوز کے ایک صاحبزادے تھے ان کا تخلص بھی داغ تھا مگر افسوس وہ عالم جوانی میں باپ کو داغ دے گئے۔ علاوہ ان کے دو ایک اور اس تخلص کے شاعر گذرے ہیں، نام اتفاق سے یاد نہیں،

⁂⁂⁂

۲۳ ستمبر ۱۹۰۰ء

مولوی محب حسین ساکن حیدرآباد پردۂ نسواں کے مخالف ہیں، اپنے رسالے معلم النسواں میں اکثر اس موضوع پر نظمیں لکھا کرتے ہیں اور مرزا صاحب سے اصلاح لیتے ہیں، آج وہ ایک نظم پر اصلاح لے رہے

تھے، اصلاح دینے کے بعد مرزا ابو صاحب بولے کہ دیکھو مولوی تم اگر مضامین پر پڑو گے تو میں الفاظ پر، محب حسین بولے کہ کس طرح، فرمایا خیالات گو تمہارے ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ محب حسین داغ کے شاگرد ہیں ضرور ان سے اصلاح لیتے ہونگے لہذا میں امداد جرم میں مطعون کیا جا سکتا ہوں، دیر تک مرزا صاحب محب حسین سے مذاق کرتے رہے اور دل لگی ہوتی رہی۔

آج بڑی دیر تک مرزا صاحب اپنے خاندانی حالات بیان کرتے رہے انہوں نے بتایا کہ میرے اجداد سمرقندی تھے، مرزا صاحب کے پردادا عارف جان جو ہندوستان آئے، ان کے دو بھائی قاسم جان اور عالم جان اور تھے، قاسم جان سب سے بڑے تھے، اٹھارہویں صدی میں یہ لوگ ہندوستان آئے، شروع میں نواب معین الملک میر منو ناظم پنجاب کے مہمان ہوئے اور کچھ عرصے وہاں رہے میر منو کی وفات کے بعد ان لوگوں کو پنجاب چھوڑنا پڑا اور قاسم جان اپنے بھائیوں کے ساتھ ہندوستان پہنچے اور شاہزادہ عالی گہر کے رفقا میں شامل ہو گئے یہی عالی گہر جب بادشاہ ہوئے اور شاہ عالم ثانی کہلائے تو قاسم جان کو شرف الدولہ خطاب ملا، بادشاہ سے اتنا قرب حاصل تھا کہ ہمہ وقت معرکوں میں ساتھ رہا کرتے تھے چنانچہ زمانۂ شاہزادگی میں کامل ۱۰-۱۱ سال قاسم جان شاہزادے کے ساتھ بہار رہے، میر صادق سے جو معرکہ ہوا تھا وہ انہیں قاسم جان سے ہوا جس میں بہت سامان ہاتھ آیا تھا، ان سب بھائیوں کا قیام دہلی کے

جس محلے میں تھا وہ محلہ قاسم جان کے نام سے اب تک مشہور ہے اور اس وقت تک ان لوگوں کے مکانات موجود ہیں، قاسم جان کے منجھلے بھائی عارف جان بھی بڑے بہادر اور جفاکش انسان تھے انہیں کے لڑکے احمد بخش خاں تھے جو آخری دور کے امراء میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے انہوں نے اپنی ذاتی قابلیت اور بل بوتے پر انگریزوں سے گوڑگانوہ کے ضلع میں فیروز پور جھرکہ اور مہاراجہ الور سے لوہارو کی جگہ حاصل کی، انہیں احمد بخش خاں کے لڑکے شمس الدین خاں ہوئے جو مرزا صاحب کے والد تھے،

آج شام کو مرزا صاحب ایک گویئے سے گانا سن رہے تھے، گویا کہیں باہر کا تھا، مرزا صاحب کا نام سن کر ان کے پاس حاضر ہوا تھا، وہ پختہ گانا گا رہا تھا، جس شغف سے مرزا صاحب گانا سن رہے تھے حاضرین میں کوئی اتنا ہمہ تن گوش نہ تھا، یکایک کانوں میں عشاء کی اذان کی آواز آئی، گویا فوراً خاموش ہو گیا۔ اذان کے خاتمہ کے بعد گویئے نے پھر گانے کی اجازت چاہی مرزا صاحب نے حاضرین کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ کہئے کچھ اور گانا سنیئے گا ـــــ فلاسفۂ یونان اور حکماء سلف نے موسیقی کو بھی ریاضت کی ہی ایک شاخ قرار دیا ہے، گانا سننے سے دل کو فرحت اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے اسی واسطے اہل تصوف کے اکثر فرقوں نے اسے بھی عبادت میں شامل کیا ہے، اب آپ لوگ فیصلہ کیجئے کہ اس وقت

اس عبادت کی طرف رجوع ہو نگے، جس کی دعوت ابھی آپ کو موذن نے دی ہے یا پھر یہی عبادت جاری رہے گی جو فردوس گوش اور دل ودماغ کی تسکین کا باعث ہے اور ایک بولتا ہوا جادو ہے، مرزا صاحب کے اس ارشاد پر سب حاضرین ہنسنے لگے، مرزا صاحب گویّے کی طرف مخاطب ہوئے، گانا ملتوی ہوا اسے کچھ انعام دینے کی ہدایت ہوئی اور محفل نماز کے لئے برخاست ہو گئی۔

---

۲۵ ستمبر ۱۹۰۱ء

آج کل حضور نظام دکن کی غزلیں قریب قریب روزانہ اصلاح کیلئے آرہی ہیں اور یہ مشہور ہو رہا ہے کہ اعلیٰ حضرت عنقریب اپنا دیوان چھپوانے والے ہیں، کچھ روز ہوئے مرزا صاحب کے پاس ایک فرمان پہنچا اور پوچھا گیا کہ آپ کے شاگردوں میں سب سے بہتر کون ہے اس خبر کو سن کر تمام شاگردوں کو عموماً اور حاضر باشوں کو خصوصاً بڑی توقعات پیدا ہو گئیں مرزا صاحب نے بعض شاگردوں سے پوچھا کہ وہ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں کہ ان کے بھائیوں میں سب سے زیادہ کس کو یہ مرتبہ حاصل ہے انہوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق چند نام پیش کئے، سن کر چپ ہو گئے دو چار دن تک ہم سب یہی خیالی پلاؤ پکتے رہے بالآخر موقع پاکر آج میں نے پوچھا کہ آپ نے فرمان شاہی کا کیا جواب دیا، کچھ سکوت فرمایا، زیر لب مسکرائے اور فرمایا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ "میرے شاگردوں میں

آپ سے بہتر کوئی شاگرد نہیں"۔ — پھر فرمایا کہ بہت ممکن تھا کہ میں وہی جواب دیتا جو تم لوگوں کے خیال میں تھا مگر ایسا جواب شاہانہ مزاج سمجھنے والے نہیں دیا کرتے۔ میں نے آنکھ کھولی ایک رئیس کے گھر میں، لڑکپن اور جوانی قلعہ معلیٰ اور دربار رام پور میں گزاری اور اب بڑھاپا یہاں گزار رہا ہوں، یہ میرا امتحان تھا، امتحان بھی بہت سخت جس میں کامیاب ہونا ہر ایک کا کام نہیں، خدا کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب ہوا، اتنا کہہ کر یہ شعر پڑھا ؎

دیکھا ہے دیکھنے کی طرح اس جہان کو
گزرا ہے اک زمانہ ہماری نگاہ سے

آج فصیح اللغات کے لئے اشعار لکھوا رہا تھا، لفظ "برا لگنا" زیرِ غور تھا مجھے حکم ہوا کہ لکھو ؎

معشوق سے شکایتِ جور و جفا ہے جرم
اس کو بری لگے تو خدا کو بری لگے

میں یہ شعر ابھی لکھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا صاحب بولے کہ یہ پہلے مصرع میں "جور و" کتنا اچھا لفظ آیا ہے اور پھر فوراً مصرع درست کر کے شعر یوں کر دیا ؎

معشوق سے شکایتِ بیداد جرم ہے
اس کو بری لگے تو خدا کو بری لگے

شعر لکھوا کر فرمایا کہ ایک دفعہ رامپور کے ایک مشاعرے میں محمد شاہ کا وہی

رامپوری شاگرد جلال ۔ نے ایک شعر پڑھا جس کا مصرع تھا ۔ ع

خود کنوئیں میں گر پڑے جو روئے دلبر دیکھ کر

یہ مصرع سن کر مجھ سے نہ رہا گیا اور کہنا پڑا کہ میاں کاوش استاد کو غزل دکھا کر پڑھا کرو، اس مصرع کو اس طرح پڑھنا چاہئے ۔ ع

جو کنوئیں میں گر پڑے خود روئے دلبر دیکھ کر

---

۱۵ ر نومبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب کی خدمت میں سورت کے ایک مولوی صاحب تشریف لائے میں بھی حاضر تھا، مرزا صاحب ان سے بڑے تپاک سے ملے، یہ انکی پہلی ملاقات تھی، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مولوی صاحب نے مرزا صاحب سے فرمائش کی کہ آپ مجھے اپنی چند غزلیں عنایت کریں کہ میں انکا عربی میں ترجمہ کرونگا، مرزا صاحب نے سوال کیا کہ کیا آپ نے اس سے پہلے کسی اردو غزل کا عربی میں ترجمہ فرمایا ہے، مولوی صاحب نے ایک چھوٹی سی بیاض جیب سے نکالی جس میں دس پندرہ ترجمے اردو غزلوں کے موجود تھے، انہیں دیکھ کر مجھے حکم ہوا کہ مولوی صاحب کی مرضی کے مطابق دو چار غزلیں لکھ کر دیدو، مولوی صاحب نے مرزا صاحب کی زبان سے کلام سننے کا بھی اشتیاق ظاہر کیا، چنانچہ مرزا صاحب نے یہ غزل سنائی : ۔

غزل

اس کی چتون نظر میں پھرتی ہے — اک چھری سی جگر میں پھرتی ہے

آہ ہر دم سفر میں پھرتی ہے — یہ تلاشِ اثر میں پھرتی ہے

نالہ کرتا ہوں تو مری آواز — گو نجتی ان کے گھر میں پھرتی ہے

وہ دمِ رقص گردشیں اسکی — ایک پھرکی نظر میں پھرتی ہے

اس کے آگے زبان مشکل سے — دہن نامہ بر میں پھرتی ہے

نہ ملے گا وہ جستجو سے داغؔ
خلق کس دردِ سر میں پھرتی ہے

غزل سنا کر مرزا صاحب خاموش ہو گئے، پھر ایک ہی منٹ بعد بولے کہ اس زمین میں ایک مقطع اور حسبِ حال ہو گیا، ارشاد ہوا ؎

آمد آمد ہے آج کس کی داغؔ
یہ سفیدی جو گھر میں پھرتی ہے

جس روز کا یہ واقعہ ہے مرزا صاحب کے مکان میں سفیدی ہو رہی تھی اور مزدور دیواروں پر سفیدی کر رہے تھے، مرزا صاحب کو غزل پڑھتے سن کر جو مزدور سفیدی کر رہے تھے وہ ہاتھ روک کر غزل سننے لگے، مرزا صاحب نے یہ دیکھا اور برجستہ یہ مقطع فرمایا۔ مقطع فرمانے کے بعد بولے کہ میاں احسن دیوان کے اصل مسودے میں یہ مقطع بڑھا دو اور اس مقطع کو اس طرح شعر کر دو ؎

بزم داغ

نہ ملے گا وہ جستجو سے کہیں

خلق کس درد سر میں پھرتی ہو

تعمیل حکم میں میں نے اسی وقت غزل میں ردو بدل کر دیا۔ سورت کے مولوی صاحب کو جو چار غزلیں لکھ کر میں نے دیں ان میں ایک غزل یہ بھی تھی ——،

مرزا صاحب کی صلبی اولاد میں صرف ایک لڑکا ہوا تھا، نام اس کا احمد مرزا رکھا گیا تھا، رام پور میں پیدا ہوا اور رام پور ہی میں فوت ہو گیا، مرزا صاحب کو اس کی موت کا آج تک افسوس ہے۔ احمد مرزا کی یادگار یہ شعر ہے ۔؎

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ

دل کا سرور تھا مری آنکھوں کا نور تھا

مرزا صاحب کی اہلیہ[1] نے خاندان کی ایک لڑکی لاڈلی بیگم[2] کو گود لے لیا تھا

---

[1] مرزا صاحب کی اہلیہ کا نام فرخندہ بیگم تھا جو انکی خالہ عمدہ بیگم کی لڑکی تھیں، عمدہ بیگم نواب یوسف علی خاں والئی رامپور سے وابستہ تھیں، آخر عمر میں نواب صاحب وظیفہ دینے لگے تھے جو نواب کلب علی خاں کے زمانے تک جاری رہا۔ انہیں عمدہ بیگم کی سفارش پر مرزا داغ ہنگامۂ غدر میں دہلی سے رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں سے متوسل ہوئے۔

[2] لاڈلی بیگم عمدہ بیگم کی نواسی تھیں، ان کی شادی ممتاز الدین احمد خاں سے ہوئی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ لاڈلی بیگم عمدہ بیگم کی کون سی لڑکی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں،

جن کی شادی جناب سائل کے بڑے بھائی کے ساتھ ہوئی تھی جن سے ناصرالدین[1] پیدا ہوئے۔ اور لاڈلی بیگم بیوہ ہوگئیں، مرزا داغ نے انہیں اپنے پاس حیدرآباد بلالیا جناب سائل انہیں لے کر روانہ ہوئے یہاں پہونچکر مرزا صاحب نے لاڈلی بیگم کا عقد سائل صاحب سے کردیا، اور اب لاڈلی بیگم مرزا صاحب کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

مرزا صاحب کے دو اخیافی بھائی بھی ہیں، ایک مرزا محمد شاہ[2] عرف

---

[1] ناصرالدین کا ذکر صفحہ ۶ پر لاڈلی بیگم کے ذکر میں ہوچکا ہے۔

[2] مرزا شاغل آغا تراب علی کے بیٹے تھے، مرزا داغ سے گیارہ سال چھوٹے تھے ایک عرصہ تک رامپور رہے، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد رامپور سے جب تمام اہل کمال رخصت ہوئے تو مرزا شاغل بھی رامپور سے روانہ ہوئے کچھ عرصہ دہلی رہے، آپ کی شادی دہلی ہی میں ہوئی تھی اس لئے چند روز دہلی رہ کر پھر رامپور آگئے، شاغل کی بیوی رام پور کے صاحبزادہ امداداللہ خاں عرف لوٹے نواب کی رشتہ دار تھیں، شاغل کا قیام بزریہ صحت خاں میں انہیں کے یہاں رہتا تھا، نواب کلب علی کی وفات کے بعد جب شاغل معاشی تفکرات میں پھنسے تو مرزا داغ نے بھائی کا بہت ساتھ دیا۔ مرزا شاغل ایک عرصہ تک عظیم آباد پٹنہ بھی رہے، آخر عمر میں رام پور واپس آگئے، پیچش میں مبتلا ہوئے اور ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی، احاطہ حضرت جمال الدین واقع محلہ بریلوی دروازہ رامپور میں دفن ہوئے، آپکی اولاد نرینہ میں ایک صاحبزادہ امراؤ مرزا نادان ہوئے جو حیدرآباد میں مرزا داغ کے ساتھ رہتے تھے، شاغل اپنے بھائی مرزا داغ کی طرح بڑے پرگو شاعر تھے، افسوس انکی تمام عمر (باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

آغا مرزا شاغلؔ، دوسرے خورشید عالم؛ مرزا صاحب کی ایک اخیافی بہن بھی ہیں خفیؔ جن کا تخلص ہے بڑی اچھی شاعرہ ہیں، اور مرزا صاحب ہی سے اصلاح لیتی ہیں، مرزا صاحب بڑے کنبہ پرور ہیں، انکے قریب قریب سب عزیز حیدرآباد آتے جاتے رہتے ہیں، بعض یہاں مستقل طور سے انکے ساتھ رہتے ہیں، جناب سائلؔ، خورشید عالم اور لاڈلی بیگم کا قیام حیدرآباد

۱؎ مرزا خورشید عالم مرزا داغ کے تیسرے بھائی تھے جو ولی عہد مرزا فخرو سے ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم و تربیت شاہانہ کر و فر سے ہوئی لیکن مرزا فخرو کے انتقال اور پھر اس کے بعد سلطنت مغلیہ کے انقطاع نے ان کو بھی خانہ برباد کر دیا وہ عرصہ تک مختلف مقامات پر رہے، مرزا داغ نے ان کی بھی کافی پرورش کی چنانچہ خورشید عالم کی عمر کا کافی حصہ داغ کے ساتھ حیدرآباد میں بسر ہوا، داغ نے ان کا بھی ریاست حیدرآباد سے وظیفہ مقرر کرا دیا تھا، داغ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک حیدرآباد رہے، ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔

۲؎ مسیح جان خفی جیسا کہ بتایا گیا بلاک نامی ایک انگریز سے پیدا تھیں، ان کا ذکر پچھلے اوراق پر ہو چکا ہے یہاں ان کے ۳ شعر ملاحظہ فرمایئے:-

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں — ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں
اے خفیؔ اپنے اشک بے تاثیر — مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانہ کے نہیں ہم

(بقیہ صفحہ ۱۱۶) پریشانی و درماندگی میں گزری مگر وہ بڑے قانع اور صابر انسان تھے

ہی میں رہتا ہے، مرزا صاحب کے اور دوسرے عزیزوں میں امراؤ مرزا نادانؔ[1]، غالب مرزا[2] سے بھی میں بذاتہ واقف ہوں، یہ سب حیدرآباد رہے ہیں اور مرزا صاحب ان کے کفیل رہے ہیں۔

۱۰؍ دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب نے مجھ سے متعدد خطوط لکھوائے، سات آٹھ خط لکھوانے کے بعد بولے کہ ایک خط اور لکھوانا تھا، لیکن وہ میں خود لکھونگا پھر کچھ سوچ کر بولے کہ اچھا تم ہی لکھو، خط منی بائی حجاب کو لکھوایا جو یہ تھا

---

[1] امراؤ مرزا نادان مرزا شاغل کے بیٹے تھے، بعض کا خیال ہے کہ وہ خورشید عالم کے بیٹے تھے لیکن یہ امر قرین قیاس نہیں ہے اس لئے کہ نادان خورشید عالم کے ساتھ شراب پیتے تھے اور ان کو چچا کہتے تھے، نادان داغ کے انتقال کے بعد مدت تک حیدرآباد رہے، ایک دفعہ شراب پی کر شراب خانے سے نکلے ہی تھے کہ ایک یکّہ سے ٹکر ہوئی اور سخت چوٹ آئی، گر پڑے جب ہوش آیا تو زبان پر یہ شعر تھا ؎

ضعف سے کوچۂ جاناں میں گرا
میں نے ٹھوکر کبھی کہاں کھائی ہے

پولس نے شفاخانے پہنچایا، ایک ہفتہ سخت تکلیف اٹھا کر شفاخانے ہی میں فوت ہوئے، نادان لاولد تھے اور آج ان کی کوئی زندہ یادگار نہیں۔

[2] غالب مرزا بھی حضرت داغ کے بھتیجے تھے لیکن کون سے بھائی کے بیٹے تھے معلوم نہ ہو سکا، مولانا احسن نے بھی ان کا کچھ حال نہ لکھا۔

دشمن جانی، سلام شوق

عین انتظار میں تمہارا محبت نامہ[1] ملا، کئی بار پڑھا آنکھوں سے لگایا، چوما، چھاتی پر دھر رہا، تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کہو گے جب ہی تمہارے پاس آوں گی، خوب. تم کو بھول جاؤں —

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
نادان[2] کس طرح، تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ، پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے، مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے، جواب میں لکھو کہ کب آرہی ہو۔

---

۱۵ دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب کے ایک شاگرد[3] الہ آباد سے تشریف لائے، وہاں

---

[1] یہ خط نامکمل ہے بالکل کیڑوں نے کھالیا ہے، خط کے شروع میں جو تحریر بین السطور ہے کیڑوں کی کھائی ہوئی مشکوک ہے جو پڑھنے میں آیا لکھا گیا۔

[2] دوسرے دن میری (احسن مارہروی) فرمائش پر اس شعر پر غزل فرمائی اور شعر میں لفظی ردوبدل کر کے اسے مقطع کر دیا —

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

[3] یہ تصویر حضرت نوح ناروی نے پیش کی تھی۔

کی ایک طوائف نے اپنی ایک تصویر مرزا صاحب کو بھیجی ہے اور تازہ غزلوں کی فرمائش کی ہے، مرزا صاحب نے اس کے تحفے کے جواب میں مجھ سے خط لکھوایا، ملاحظہ ہو:-

حور کی صورت، نور کی مورت، خوش رہو اور ہم سے ملو تمہارے پیغامبر تشریف لائے، بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے تمہارا ہدیہ پیش کیا یعنی تمہاری تصویر، تصویر نہیں بلکہ تیر نام پوچھا تو خواہ مخواہ یقین لانا پڑا، بار خدایا، ایسی صورت بھی

لہ مرزا داغ کا یہ خط تین چار جگہ نقل ہو چکا ہے، سب سے پہلے یہ خط انشائے داغ میں نقل ہوا، اس کے بعد مجموعہ خطوط موسومہ "زبان داغ" میں لکھا گیا، میرے ایک مضمون منی بائی حجاب اور داغ" میں بھی اس کا حوالہ موجود ہے، جناب نوح ناروی نے بھی اس خط کو نگار کے "داغ نمبر" میں اپنے مضمون میں لکھا ہے اور اب یہ خط اس جگہ نقل ہو رہا ہے، دراصل یہ خط شروع میں احسن صاحب مارہروی کے لکھے ہوئے روزنامچے کے مسودے سے نقل ہوا یہ خط مسودے کے جن اوراق پر لکھا ہے وہ جگہ بہ جگہ کیڑوں نے کھا لیا ہے لہذا اس کمی کو نقل نویس نے خط کی ترتیب قائم رکھنے کیلئے اپنی سمجھ سے قائم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ بالا چار پانچ مقامات پر جہاں جہاں یہ خط نقل ہوا ہے فرق ہو گیا، میں نے اس جگہ مسودے کی ہو بہو نقل کر دی ہے، جو مقام کرم خوردہ ہیں، ان لفظ پر خطوط کھینچ دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے تفاوت کا اندازہ کر سکیں،

تونے پیدا کی ہے، سیرت کی تعریف سی تو صورت سے بڑھ کر، خوش آواز خوش مزاج اور پھر اس پر لکھی پڑھی، زمانہ ایسے لوگوں کی جس قدر قدر کرے کم ہے ؎

بت ہی پتھر کا کیوں نہ ہو اے داغ
اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

کیوں جی تم سے کیونکر ملیں، تم کو کیونکر دیکھیں، کیوں کر سنیں اور اگر دیکھیں تو کیونکر جئیں، جو شخص عاشق مزاج ازلی ہو خیال کر لو کہ اس کو کیا حال ہوگا، تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی آؤ، ہائے مجبوری اور وائے مہجوری، میں نے سنا ہے مہتاب داغ تمہارے پاس نہیں ہے، بطور تحفہ بھیجتا ہوں اگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے تو غنیمت ہے، سوء ادبی کے خیال سے تمہارے نام میں ایک نقطہ کا رد و بدل مناسب رہے گا، نون کا نقطہ "ب" کی جگہ اور "ب" کا نقطہ "نون" کی جگہ ہونا چاہئے یعنی "نبی جان" کی بجائے "بنی جان" ہونا چاہیئے آخر خط میں یہ رباعی فی البدیہہ کہہ کر تحریر کروائی ؎

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے تیر ۔۔ سوجھی ہے نئی طرح کی تجھکو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دکھلا کر ۔۔ کھچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

۲۵ / دسمبر ۱۹۰۱ء

منی بائی حجاب جن پر مرزا صاحب کلکتے میں عاشق ہوئے تھے اور جن کے مرزا صاحب طلبگار تھے، حیدر آباد آنے کو آمادہ ہو گئیں، چند برس ہوئے حجاب نے کوئی شخص جسے ہیں ان سے نکاح کر لیا ہے خلا خلا کر کے ان سے طلاق لی، مرزا صاحب کو خط لکھا، سن کر خوش ہو گئے آج بعد مغرب حسب معمول ایک طرف صدر میں مرزا صاحب بیٹھے تھے، چند اور احباب بھی تشریف فرما تھے، فرمانے لگے دس برس میں ابھر پڑے سے کچھ نہ ہوا تو کیا عین طلاق کے زمانے میں کچھ ہو سکا ہو گا، بھائی مجھ سے تو یہ نہ ہو گا کہ میں ان کو عدت میں بٹھاؤں، ویسے تو وہ میرے نزدیک ۲۲ برس سے عدت میں بیٹھی ہوئی ہیں۔

مرزا صاحب نے کلکتہ کا ذکر کرتے ہوئے آج ایک لطیفہ سنایا عبدالرزاق صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا اور بجائے پہلے سے دعوت دینے اور مصرع طرح بھیجنے کے، مشاعرے سے کچھ ہی پہلے تشریف لے آئے اور شرکت کیلئے مصر ہوئے۔ میں کچھ ایسا مجبور ہوا کہ مشاعرے میں شریک ہونا پڑا لیکن شرط یہ ہوئی کہ مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں غزل کہہ لوں، چنانچہ ایک کمرے میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا اور میں نے فکر سخن،[1]

---

[1] اس مشاعرے کی طرح میں مرزا صاحب نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع ہے

اے داغ پر امان نہ تو اس کرکے گا ۔ معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

شروع کی، اسی دورانِ فکر پٹنہ کے دو سرکاری عہدے دار میری ملاقات کو پہونچے، بزرگ صورت، گورے چٹے، سفید لباس اور سفید ریش و بروت کے وہ لوگ حامل تھے، لوگوں نے انہیں بتادیا کہ میں فلاں کمرے میں ہوں، وہ لوگ بلاتکلف اس کمرے میں چلے آئے اور مجھے مصروفِ سخن دیکھ کر ایک طرف بالکل خاموش کھڑے ہوگئے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب تک خاموش اسی طرح کھڑے رہے میں اپنی فکر اور دُھن میں اتنا مصروف تھا کہ ان کے آنے اور اس طرح کھڑے رہنے سے بالکل ناواقف تھا، یکایک میری نظر اوپر اٹھی، ان دونوں کے وجود سے چونکہ بالکل خالی الذہن تھا اور ذہن دوسری دھن میں تھا، بے ساختہ میری زبان سے یہ جملہ ادا ہوا،

"ہیں! ابھی سے منکر نکیر کہاں سے آگئے، میں تو ابھی
زندہ ہوں۔"

میرے اس جملے پر وہ دونوں مسکرائے اور مجھے بدستور کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گئے،

۲۶ر دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مغرب کے وقت حسبِ معمول محفل آراستہ تھی، روزمرہ کے حاضر باش شاگرد تشریف فرما تھے، میں بھی حاضر تھا، فرمانے لگے کیوں جی منی بائی واقعی تشریف لے آئیں گی لوگوں نے کہا کیوں نہیں

بولے دس برس ایک شخص کے عقد میں رہنے کے بعد اب طلاق حاصل کی ہے اور وہ محض میری خاطر تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کلکتہ ہی اٹک کر رہ جائیں اور یہاں تک نہ پہنچیں، اسی طرح مرزا صاحب بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، آج کل شب و روز منی بائی ہی کا ذکر رہا کرتا ہے اور نئے نئے انداز اور زاویوں سے منی بائی پر گفتگو ہوتی ہے۔

مرزا صاحب بڈھے ہو گئے ہیں لیکن جوانوں کا سا ولولہ ابھی موجود ہے، پرانی محبت پھر جوش پر آئی ہوئی ہے، چند برس سے منی بائی نے کوئی صاحب "چھٹے میاں"[1] نام کے ہیں ان سے عقد کر لیا ہے، منی بائی اور مرزا صاحب سے کلکتہ کی ملاقات کے بعد سے خط و کتابت کا برابر سلسلہ جاری ہے لیکن اس دوران ملاقات نہ ہو سکی، پرانے لوگوں میں وضعداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، مرزا صاحب بھی اس سے خالی نہیں، منی بائی کی محبت اب تک رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے خطوط میں القاب بڑے مزے کے لکھتے ہیں، زیادہ تر القاب دشمن جانی لکھتے ہیں اور منی بائی مرزا صاحب کو حاجی صاحب لکھا کرتی ہیں۔ میں نے مرزا صاحب کے اکثر خطوط کی نقول حاصل کر لی ہیں اور حتی الوسع حجاب کے خطوط کی بھی نقول حاصل کر لیتا ہوں جو کسی وقت بڑی کار آمد

---

[1] ان کا اصل۔ آل احمد صاحب اور عرف چھٹے میاں تھا، مولوی تھے اور کلکتے کے ہی رہنے والے تھے اس سے زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا۔

چیز ہو نگی، میرے اس عمل در آمد کا جب مرزا صاحب کو پتہ لگا تو فرمانے لگے کہ عالم زندگی میں کیا کم رسوا ہوں جو مرنے کے بعد بھی مجھے رسوا کرنا چاہتے ہو، مرزا صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں بہت متاثر ہوا، اور کہا کہ ان تمام یادداشتوں کو پھاڑ دوں گا اور نذر آتش کردونگا، مرزا صاحب ایک ساتھ ہنس پڑے اور بولے کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی اس کوشش کو یوں ٹھکانے لگاؤ، میری رسوائی کے لئے میری شاعری ہی کیا کم ہے جو یہ خطوط اور یہ حالات مجھے تشویش اور فکر میں ڈالیں، تم جو کر رہے ہو کرتے رہو اور اس طرح سے

ایک دن ہم نہ ہونگے دنیا میں
اور رہ جائے گی ہماری بات

مرزا صاحب کی محبت نے منی بائی کے دل پر وہ اثر کیا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا انہوں نے حسے صاحب سے طلاق لے لی ہے اور اب مرزا صاحب کو خط لکھا ہے کہ میں آ رہی ہوں، آج خط ملا ہے، مرزا صاحب بہت خوش ہیں، حجاب کا خط آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:-

قدر افزائے من مرزا صاحب، تسلیم مع التکریم
انتظار کی گھڑیاں اب ختم ہی ہوا چاہتی ہیں، میں نے خود یہ تمام وقت ایک عجیب الجھن میں گزارا ہے ان دنوں علاوہ

ؔ مولوی انتخار عالم صاحب مارہروی

تنہائی کے اور بھی بعض ناگہانی فکروں سے سابقہ پڑا جن کو بالتفصیل ہی بیان کیا جا سکتا ہے، اس زمانے میں کتب بینی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتی رہی، اب اس شغل میں ایک عجیب ہی لطف آتا ہے۔

میرا ارادہ تنہا ہی روانگی کا تھا ممکن ہے بعض وجوہ سے خود ایک عزیز ساتھ ہوں بہر حال خدا بخش کو ضرور لاؤنگی اسے مجھ سے زیادہ آپ کے پاس پہنچنے کا اشتیاق ہے، گھر کے لوگ ابھی سے میرے ترکِ وطن سے سست رہنے لگے ہیں، کلکتہ و حیدرآباد کا فاصلہ واقعی بڑا حوصلہ شکن ہے لیکن آپ کی محبت سہارا بنی ہوئی ہے اور دل چاہتا ہے کہ تمام موانع جلد دور ہوں اور میں آپ کے پاس پہونچ جاؤں، زیادہ کیا عرض کروں باقی حالات بدستور ہیں،

راقمہ

منی از کلکتہ ۸ ار دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب بولے کہ جب ہم بچے تھے تو "عمدہ" نامی ایک ماما ہمیں کھلانے پر مقرر تھی، وہ کہیں پورب کی رہنے والی تھی، ہمارا سن اس وقت کوئی ۹ یا ۱۰ برس کا ہوگا، جب کبھی زیادہ گرمی پڑتی تھی اور ہوا بالکل بند ہو جاتی تھی تو ہم اس سے کہا کرتے تھے کہ ہوا چلا، ہمارے

اس کہنے پر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگتی، اس کی زبان سے یہ بے معنی الفاظ ادا ہوا کرتے تھے:۔

"بابوش بابوش باماکا بگنی کا المُوری
کسموری ہنڑ کرے بادل اڑی جائے"

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ماما کے اس طرح پڑھنے سے فوراً ہوا چل اٹھتی تھی۔

آج ہی کا واقعہ ہے کہ مرزا صاحب باہر بیٹھے تھے، نہ معلوم کس ضرورت سے ملازم کو آواز دی، ملازم کے آنے میں دیر ہوئی، مرزا صاحب جھنجھلا گئے، جس ملازم کو آواز دی تھی اس کا نام "شیخی جی" ہے ۷۰ برس کا سن ہوگا جب شیخی جی دوسری آواز پر آئے تو مرزا صاحب نے فرمایا کہ آخر تم کہاں تھے، شیخی جی نے کہا کہ میں وظیفہ پڑھ رہا تھا، مرزا صاحب ہنسکر بولے کہ تم اپنا خالی وقت بتادو کہ میں اسی وقت تم کو بلایا کروں، میں تو جب بھی تم کو بلاتا ہوں یہی سنتا ہوں کہ وظیفہ پڑھ رہے ہو، بھائی کیا تم نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ جو شب روز خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہتے ہو، اتنا سن کر شیخ جی تو اپنے کام میں الگ گئے، مرزا صاحب ہم لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر بولے کہ یہ حضرت دلّی کے رہنے والے ہیں بڑے قبر پرست اور فقیر نواز ہیں ان کا قاعدہ ہے کہ ہر جمعرات کو کوہ مولا جو حیدرآباد سے غالباً تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے شب کو

بعد مغرب چلے جاتے ہیں اور تمام رات وہاں بسر کرتے ہیں، ہندوستان کا کوئی ولی ایسا نہیں ہے جس کے حالات سے آپ واقف نہ ہوں جب کبھی موج میں ہوتے ہیں بعض بزرگانِ دین کا جھوم جھوم کر ذکر کرتے ہیں اور فیضانِ روح کے سلسلہ میں سینکڑوں حکایات سناتے ہیں، میرے دل میں چونکہ خود بزرگان دین کی عزت ہے اس لئے ان کے شغل میں مداخلت نہیں کرتا، خواجہ معین الدین اجمیری سے جو مجھے عقیدت ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے، مجھے جو کچھ عزت حاصل ہوئی ہے انہیں بزرگانِ دین کے فیضان کا نتیجہ ہے۔

٭٭٭٭٭٭٭٭

میں نے مرزا صاحب کے شاگردوں کا ایک رجسٹر بنا لیا ہے جس میں کل شاگردوں کے نام مع ان کے مکمل پتوں کے درج ہیں، جو نیا شاگرد ہوتا ہے اس کا نام و پتہ بھی درج رجسٹر ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک رجسٹر ترسیل خطوط کا بھی بنا لیا ہے، جو خطوط مرزا صاحب کی طرف سے روانہ کئے جاتے ہیں وہ درج رجسٹر کر کے روانہ کئے جاتے ہیں اور ان خطوط پر رجسٹر کا نمبر ڈالا جاتا ہے۔

آج نوح صاحب ناروے والے تشریف لائے ہوئے ہیں اور مرزا صاحب کے شاگرد ہیں، شاگردوں والا رجسٹر ملاحظہ فرما رہے تھے، اپنا نام رجسٹر میں دیکھ کر بولے کہ میرا نمبر ۵۰۰ ہے اور میرے بعد بھی بہت سے نام ہیں اور یہ فہرست شاگردان تقریباً دو ڈھائی ہزار شاگردوں کی ہے اسطرح

قیامت میں جہاں اور بہت سی امتیں نظر آئیں گی وہاں ہمارے استاد کی بھی ایک امت ہوگی، مرزا صاحب نے یہ جملہ سنا، مسکرائے اور فرمایا کہ جس کی امت میں نوح جیسے پیغمبر ہوں اس کی امت کا کیا کہنا، اس برجستگی پر سب لوگ ہنسنے لگے اور نوح صاحب نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

مرزا صاحب نے برسرِ تذکرہ فرمایا کہ میں نے خاقانیٔ ہند جناب ذوق سے کامل ۱۲ سال اصلاح لی تھی میرا پہلا دیوان جب مکمل ہو گیا تو میں نے استاد کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ گو آپ اس دیوان کی تمام غزلیں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ان غزلوں کی اصلاح ہو چکی ہے لیکن اگر مضائقہ نہ ہو تو ایک بار اس مجلد کو اور ملاحظہ فرما لیا جائے، استاد نے وہ مجلد مجھ سے لے لیا اور ایک ہفتہ کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کیا کہ میں نے کل غزلوں پر نظر ثانی کر لی ہے اور جہاں جہاں مزید اصلاح کی ضرورت محسوس کی ہے وہ بھی کر دی ہے تم اتنا اور کرو کہ اس مجلد کے حاشیوں پر وہ تمام اصلاحیں بھی درج کر لو جو اس سے پہلے میں دے چکا ہوں، بارہ برس کے بعد اس اصلاح کو دیکھنا اس وقت اس کا صحیح لطف تم کو آئے گا چنانچہ وہ مجلد نیز دوسرے تمام اصلاحی مسودات مرزا صاحب کے پاس محفوظ ہیں اور وقتاً فوقتاً ایک عجیب شوق اور ولولے کے ساتھ ان اصلاحوں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔

---

۲۷ / دسمبر ۱۹۰۱ء

آج شام کو حسبِ معمول محفل جمی ہوئی تھی روزے کے افطار کا وقت قریب تھا، حاضرین میں سے دو چار روزے دار بھی تھے، بار بار آسمان دیکھا جا رہا تھا گھڑیوں پر نظریں جمی ہوئی تھیں اور وقت افطار کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا، دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے اور پکوان چُنے ہوئے تھے، شیشے کے جگوں میں پانی رکھا ہوا تھا، مرزا صاحب مزے سے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے — اور خمیرے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، لوگ حقے کے لئے ترس رہے تھے، یکایک اذان کی آواز آئی لوگ دسترخوان کی طرف بڑھے، مرزا صاحب بھی حقے کی نے منہ سے نکال کر دسترخوان پر یہ کہتے ہوئے پہنچے کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں روزہ بھی نہ رکھوں اور افطار کے ثواب سے بھی محروم رہوں گیا آپ لوگوں کا یہ مطلب ہے کہ پورا کافر ہو جاؤں"

مرزا صاحب کے اس جملے سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے اور سب نے مل کر روزہ افطار کیا۔

آج مرزا صاحب نے فرمایا کہ دو چار خط روز ایسے آتے ہیں کہ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کر لیجئے، ایسے امیدواروں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے، میں پریشان ہوں کہ لوگوں کو شاگرد کر کے انکے کلام پر اصلاح دینے کے لئے وقت کہاں سے لاؤں۔ یہ فرما کر مجھے حکم دیا کہ

آج سے ایسے تمام خطوط واپس کر دیئے جایا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ امیدوارِ فیض ہیں ان کو محروم نہیں کرنا چاہیئے، میری اس عرض پر کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے اچھا آئندہ ایسا کیجئے کہ نئے امیدواروں کو لکھ دیا کیجئے کہ منشی امیر احمد صاحب مینائی سے رجوع ہوں، وہ بھی نامی گرامی استاد ہیں اور ان سے فیض اٹھانا چاہیئے، پرانے شاگردوں کے معاملے میں مجبوری ہے ان کے کلام کی اصلاح کے لئے بہر نوع وقت نکالنا پڑے گا، لیکن ان کو بھی لکھ دیجئے کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ غزل نہ بھیجا کریں، میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان کی دو دو چار غزلیں ایک ساتھ دیکھ سکوں۔

---

۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء

آج کی نشست میں مرزا صاحب سفرِ کلکتے کے سلسلے میں عظیم آباد (پٹنہ) کے قیام وغیرہ کا دیر تک ذکر کرتے رہے، آپ نے فرمایا کہ عظیم آباد کے قیام کرنے کی اصل وجہ میرے بھائی آغا مرزا شاغل تھے جو ابتداً میرے ساتھ رامپور رہے اور پھر عظیم آباد جا رہے تھے، انہیں جب میرا کلکتے جانا معلوم ہوا تو اصرار کیا کہ میں عظیم آباد رکتا ہوا جاؤں میرا قیام انہیں کی معرفت میر باقر[1] کے یہاں رہا، شاغل بھی میر صاحب کے مکان سے متصل ہی محلہ

---

[1] میر باقر کا عظیم آباد کے ایک قدیم خاندان سے تعلق تھا، شاعر بھی تھے وحید اللہ الہ آبادی سے تلمذ حاصل تھا، خوشنویسی اور شطرنج کے دلدادہ تھے (دبابی صفحہ ۱۲۱)

گرہٹہ ہی میں رہتے تھے، میرے عظیم آباد پہنچتے ہی وہاں کے بامذاق اور باعلم لوگوں میں ایک سیلاب سا آگیا، چاروں طرف مشاعرے ہونے لگے، میری دعوتوں پر دعوتیں ہونے لگیں، جوق در جوق لوگ مجھ سے ملاقات کرنے آتے، میر باقر کا مکان تماشا گاہ بنا ہوا تھا، سارا عظیم آباد اُمڈ آیا تھا ہر شخص مجھ سے آکر ملتا، غزل سنتا اور غزل سناتا، کوئی شاگرد ہوتا، الغرض عظیم آباد کے قیام کے یہ چند روز بڑی مصروفیت اور دلچسپی کے ساتھ گزرے میرے پہنچنے پر وہاں مشاعرے تو بہت سے ہوئے لیکن دو ایک مشاعرے ایسی خصوصیت کے حامل تھے کہ وہ آج تک مجھے یاد ہیں،

اتفاق سے جس روز میں پہنچا اسی روز ایک مشاعرہ محلہ مغل پورہ میں ایک رئیس[1] کے یہاں ہونا تھا، طرح تھی ع

آباد کبھی خانۂ ویراں نہیں دیکھا

جن رئیس کے یہاں مشاعرہ تھا انہیں جب میرے پہنچنے کی خبر ہوئی خود سواری لے کر تشریف لائے اور مشاعرے کی شرکت کی نہ صرف دعوت دی بلکہ اتنا اصرار کیا کہ مجھے ان کی خواہش پوری کرنا پڑی، اسی وقت انہیں کی موجودگی میں ۲۰ یا ۲۵ شعر کہے اور کچھ شعر راستے میں کہہ کر غزل مکمل کرلی، غزل کا مطلع تھا ؎

---

[1] ان رئیس کا نام غالباً بادشاہ نواب خاں تھا

(بقیہ صفحہ ۱۳۱) چونکہ مرزا شاغل کو بھی ان دونوں چیزوں سے خاص لگاؤ تھا، لہذا دوستی دیک جہتی میں اضافہ ہوا اور شب و روز کی نشست رہنے لگی،

اس کعبۂ دل[1] کو کبھی ویراں نہیں دیکھا
اس بت کو کب اللہ کا مہماں نہیں دیکھا

اس غزل کا مقطع تھا ـــ

کیا پوچھتے ہو کون ہے کس کی ہے یہ شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

میرے خیر مقدم میں میر باقر نے جو مشاعرہ کیا وہ بھی بڑے اعلیٰ پیمانے کا مشاعرہ تھا، طرحی غزل میں جب میں نے اپنا یہ شعر پڑھا ـــ

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہاتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں[2]

تو مشاعرے میں داد کی ایک لہر دوڑ گئی جس کا سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا، متعدد بار مجھے یہ شعر پڑھنا پڑا، عظیم آباد کے لوگوں نے جس محبت و گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے نوازا اس سے میں آج تک بہت متاثر ہوں۔

---

[1] دیوان میں "خانۂ دل" ہے

[2] اسی غزل کا مشہور مقطع ہے ـــ

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

مرزا صاحب کے اس شعر پر کہ ؎

خار حسرت بیان سے نکلا ‌ ‌ ‌ ‌ دل کا کانٹا زبان سے نکلا[1]

بڑے بڑے اعتراض ہوئے ہیں آج عمویم افتخار عالم صاحب نے فرمایا کہ حضرت میں نے خار حسرت کے جواز میں بڑی تلاش کے بعد کچھ اشعار فارسی شعراء کے جمع کئے ہیں، ان اشعار میں ان اساتذہ نے خار حسرت ہی کو نہیں باندھا ہے بلکہ اس کو مختلف انداز میں معمولی رد و بدل کیساتھ نظم کیا ہے چنانچہ "خار حسرت" کا استعمال شفائی نے یوں کیا ہے ؎

باغبان گو کہ گل بر مردم آزادہ ریز

خار حسرت ہرچہ داری بر من ناشاد ریز

اسی خار حسرت کو ایک دوسری شکل دے کر صائب نے بھی باندھا ہے

---

[1] مضامین چکبست کے صفحہ ۲۰۱ پر مرزا صاحب کا ایک خط دیا گیا ہے جو اسی شعر سے متعلق ہے، لکھنؤ کے کسی شخص نے غالباً مرزا صاحب کو اس سلسلہ میں خط لکھا تھا، مرزا صاحب ان کو جواب دیتے ہیں:۔

جناب من سلمہ اللہ تعالےٰ

آپ کا کارڈ جواب میں آیا، حساد نافہم سے بحث نہیں، انکا جواب خاموشی ہے اور آج تک جتنے اعتراضات میرے کلام پر ہوئے ہیں میں نے انکو ہیچ جانا مگر آپکے اطمینان کے واسطے دو حرف لکھے دیتا ہوں کہ کانٹا دل کی پھانس کی جگہ نہیں ہے بلکہ "خار حسرت" سے بنایا گیا ہے اس سے محاورے سے بحث نہیں ۔

داغ دہلوی ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ یوم یکشنبہ

این خارِ غم کہ در دلِ بلبل نشستہ است
از خونِ گل خارِ خود او دل شکستہ است

صائب کا ایک شعر اور ہے ؎

ہر کہ خارِ آرزو در دیدۂ دل بشکند
بے تامل پائے در دامانِ منزل بشکند

اور دوسرے فارسی شعراء نے بھی خارِ حسرت کو مختلف و متنوع شکلیں دے کر پیش کیا ہے، چنانچہ فغانی کہتا ہے ؎

صد خارِ بلا از دل دیوانہ ما خاست
ہر روز کہ بے ساقیٔ گل چہرہ نشستیم

جمالؔ سلمانی کا شعر ہے ؎

خارِ سودا بتو در دل بہوائے گل وصل
بشاندیم ہمہ خونِ جگر با آورد

ثانی کا شعر ہے ؎

ہیچ شاخِ گلے بلبل حزیں نہ نشست
کہ خارِ تفرقہ اش در دلِ غمیں نہ نشست

ایسی امثال کے مواجہہ میں مخالف گروہ کو بڑا منہ توڑ جواب دیا جا سکتا ہے یہ کہتے ہوئے افتخار عالم نے مرزا صاحب سے اجازت چاہی کہ جواب دیا جائے مگر مرزا صاحب نے فرمایا کہ نہیں اسکی کوئی ضرورت نہیں،[1] ایسے

---

[1] مرزا داغ کے کلام پر محض بہ سلسلہ حسد و رقابت اکثر انکی زندگی میں (باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

بزم داغ

حاسدوں اور معترضوں کے لئے میرا صرف یہ جواب ہے ؎

اثر ہے خارِ حسرت کے بیاں میں
کہ اس کے حرف چبھتے ہیں زباں میں

مرزا صاحب کے حکم اور منشا کے خلاف کس میں ہمت تھی کہ وہ لب ہلا سکتا لہذا ہم حاضر باش تلامذہ کی تمنائیں مخصوص اس معاملے میں کبھی پوری نہ ہوئیں اور انہوں نے اپنے احباب و تلامذہ کو کبھی کسی اعتراض کی جواب دہی کی اجازت نہیں دی۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۵) اعتراضات ہوئے لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انہوں نے جواب دہی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی ورنہ انکے شاگردوں میں ایسے ایسے جادو نگار اور پرکالۂ آتش تھے کہ ہر اعتراض کا منہ توڑ جواب دے سکتے تھے مگر مرزا داغ چونکہ بالطبع شر پسند طبیعت کے حامل نہیں تھے اس لئے انہوں نے ہمیشہ حتی الوسع فضول بحث و تکرار سے احباب و تلامذہ کو روکے ہی رکھا اور کسی کو انکی یاوہ گوئی کا کوئی جواب نہیں دیا، صفدر مرزاپوری شاگرد امیر مینائی نے اپنی کتاب موسومہ "حسنِ خیال" میں جو درحقیقت مجموعہ ہے ادبی لطائف کا ایک واقعہ لکھا ہے (دیکھئے صفحہ ۱۲۱)

"خاکسار مولف (صفدر مرزاپوری) سے زمانہ قیام حیدرآباد دکن خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا، ایک دفعہ منشی بینی پرشاد صاحب وکیل مرزاپور جو سخن فہمی کے مدعی تھے، کسی نے ان کے سامنے۔

(باقی صفحہ ۱۳۷ پر)

۳۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء

مولوی محب حسین جو رسالہ معلم النسواں کے اڈیٹر ہیں بعد مغرب مرزا صاحب کے پاس تشریف لائے، ہم سب لوگ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے، محب حسین ہم سب لوگوں سے بڑے تپاک سے ملے اور بڑی گرمجوشی کا اظہار فرمایا میں نے کچھ دیر کے بعد مولوی محب حسین سے پوچھا کہ حضرت معلم النسواں کیوں بند کر دیا، وہ میرے سوال کا

(بقیہ صفحہ ۱۳۶) داغ کا یہ شعر پڑھا ہے

عمر بھر حسن خداداد رہا کرتا ہے
دو گھڑی بعد بگڑتے ہیں سنور نے والے

انھوں نے کہا۔ "داغ نے دھوکا کھایا، حسن خداداد عمر بھر ہرگز نہیں رہتا"۔ بڑھاپے اور شباب میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے، گالوں پر جھریاں پڑجاتی ہیں، قد خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے، تمام اعضا بڑھاپے میں جواب دے دیتے ہیں میں نے وکیل صاحب کا اعتراض لکھ کر حضرت داغ کی خدمت میں بھیجدیا میرے عریضے کے جواب میں جو گرامی نامہ صادر ہوا اس میں یہ پھڑکتے ہوئے الفاظ تھے

"کوئی بوڑھا یا کوئی بڑھیا کیا خوبصورت نہیں ہوتی؟
شانِ حسن خداداد کسی زمانے میں نہیں جاتی۔ اس پر بھی معترض صاحب نہ مانیں تو میری بلا سے"

"داغ دہلوی"

جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ مرزا صاحب بولے کہ "بھائی معلم النسواں ابھی بند نہیں ہوا ہے بلکہ عدت میں بیٹھا ہوا ہے" مرزا صاحب کے اس گرم جملے سے سب لوگ ہنسنے لگے۔

منی بائی حجاب جنکی جلوہ نمائی "مثنوی فریادِ داغ" کے پردے میں پھیلی ہوئی ہے ایک مدت کے بعد کلکتے سے حیدرآباد آنے والی ہیں مرزا صاحب ایک عرصے سے مختلف تدبیریں ان سے ملنے کی کر رہے ہیں اب بشرالطِ چند وہ انکے پاس آنے کو رضامند ہوئی ہیں پھر بھی مرزا صاحب کو والہانہ شبہات سے تھوڑی بہت بے اطمینانی باقی ہے، آج دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی کہ حجاب کلکتہ سے حیدرآباد آئیں گی بھی یا نہیں، مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے خاص خاص بے تکلف احباب و شاگرد جمع تھے حکم ہوا کہ دیوانِ حافظ لاؤ، دیوان لایا گیا مجھ سے بولے کہ احسن تم سیّد ہو اور حافظ فاتحہ پڑھ کر خواجہ کی روح کو ثواب پہنچاؤ اور کتاب کھولو، میں نے تعمیل حکم کی کھولتے ہی یہ شعر نکلا ؎

در کارِ گلاب و گل حکمِ ازلی ایں بود
کاں شاہدِ بازاری ویں پردہ نشیں باشد

لسان الغیب کی اس عقدہ کشائی نے مرزا صاحب کو بے حد مسرور کیا، ایسی صریح صراحت کے بعد کسی اور شگون لینے کی ضرورت نہیں تھی مگر مشتاق دلِ بے صبر عاشق مزاج کو اطمینان کہاں، رمالی کے پانسے نکالے گئے اور

ہاتھوں کو گھما کر پانسوں کو سطح پہ پھینکا گیا۔ حساب لگایا تو یہ جواب تھا:۔
"حجاب آنے کو ہیں مگر روپیہ نہیں"

---

۳۱ ردسمبر ۱۹۰۱ء

مرزا صاحب کے داد دینے کا طریقہ بھی دوسرے شعراء سے بالکل مختلف ہے۔ وہ عام شعراء کی طرح کسی اچھے شعر کی داد واہ واہ سے نہیں دیتے بلکہ بڑی خاموشی اور متانت سے شعر سنتے رہتے ہیں شعر کوئی اچھا ہوا تو بہت خوب کیا کہنا اور بہت اچھا کہتے ہیں یا شعر کو دوبارہ پڑھواتے ہیں، شاگردوں کے کلام کو سننے کا انداز بھی بالکل مختلف ہے۔ اگر کوئی شعر اچھا ہوا تو ماشاءاللہ کہدیا اور اگر کسی شعر کو ڈھیلا پایا تو خاموش رہے دوسرے مبتدی شعراء کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا ہے بلکہ کسی شعر میں اگر سقم ہوتا ہے تو اس کا اظہار بلاتکلف کر دیتے ہیں، احباب اور ہم چشم شعراءؔ کا کلام اگرچہ بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں مگر داد واجبی ہی دیا کرتے ہیں، محض اخلاقاً داد دینے کے مرزا صاحب عادی نہیں ہیں ان کی یہ عادت ان لوگوں کے حق میں بھی بدستور رہتی ہے جو معزز اور موقر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کبھی ایسے لوگ اپنا کلام سناتے ہیں تو ان کے حاشیہ نشین اور حاضر باش واہ واہ اور آوازۂ داد سے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں مگر ہم نے مرزا صاحب کو ایسے مواقع پر بھی بڑا متین اور متحمل پایا اور بہت قاعدے و قرینے سے داد دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

وہ اچھے اشعار پر ہمت افزائی اور غلط اشعار پر اعتراض کرنے سے ذرا نہیں چوکتے۔ اور اکثر دیکھا ہے کہ ان کے اعتراض سے بدمزگی نہیں پیدا ہوتی ہے۔ مرزا صاحب جس طرح مقامی احباب و شاگردوں سے اس سلسلہ میں مسلوک ہوتے ہیں بالکل یہی طریقہ ان کا ان غزلوں کے حق میں رہتا ہے جو انہیں ذریعہ ڈاک موصول ہوتی ہیں، وہ ایسی غزلوں پر بھی حسبِ موقع اچھی یا بری رائے کا بلا تکلف اظہار کرتے ہیں[1]۔

---

[1] مرزا داغ کی اس خصوصیت اور اس وصف سے متعلق مرزا محمد تقی بیگ صاحب مائل دہلوی بھی جو داغ کے خواجہ تاش تھے اپنی کتاب "سرنوشت" میں صفحہ ۲۸ پر تائید کرتے ہیں، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

"مجھے افسوس یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سخن فہم ناثر ہوں کہ ناظم شعر فہمی تو شعر فہمی انکو طریقہ داد دینے کا بھی نہیں آتا۔ داغ مرحوم نے حیدرآباد جاتے ہوئے دو ایک روز جے پور بھی قیام کیا تھا میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت ان کو دورانِ سر تھا، مجھ سے فرمایا کہ کچھ پڑھو، میں نے کہا آپ کو دورانِ سر ہو رہا ہے، کہا اس کا علاج یہی ہے میں نے پڑھنا شروع کیا تو پندرہ غزلیں میری ایک جلسہ اور ایک حالت میں سنیں، ہر شعر کو نہایت غور و خوض سے سنا اور معمولی داد جیسی لوگ دیا کرتے ہیں واہ واہ کسی شعر کی نہیں دی، ہر شعر کے متعلق عیوب و محاسن بیان کرتے چلے گئے اگرچہ اس نیازمند نے حالی، سالک، انور، ظہیر، روتق اور مجروح وغیرہ کو بھی کلام سنایا اور داد جیسی چاہیے پائی، لیکن وہ مزا داغ کی اہاہا

آج مرزا صاحب گزشتہ اذکار کرتے ہوئے بولے کہ میں سعد آباد ضلع متھرا میں اپنے دوست اور شاگرد کنور اعتماد علی خاں[1] کا مہمان تھا، ایک روز شام کو کوٹھی کے برآمدے میں کنور صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور حقے کا شغل ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بچہ سات آٹھ سال کا کھیل رہا تھا برآمدے کے دروں میں جگہ بہ جگہ طوطوں، بلبلوں، میناؤں اور دوسرے

---

[1] کنور اعتماد علی خاں قصبہ سعد آباد ضلع متھرا کے ایک بڑے رئیس اور مرزا صاحب کے عزیز ترین شاگرد تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۰) مرزا داغ کا سا نہ آیا

[2] ابو القاسم محمد شمس خلف حضرت نساخ دسنہ ولادت ۱۸۶۲ء وفات ۱۹۰۵ء شاگرد داغ کو مرزا صاحب نے انکی ایک غزل کی داد میں یہ جملہ لکھا "تم اچھے، تمہاری بات اچھی، تمہاری زبان اچھی" (دیکھو بنگال میں اردو صفحہ ۲)

اسی طرح ایک دفعہ انہیں کو مرزا صاحب نے ان کے اس شعر پر کہ ؎

قافلے والوں سے ہیں بچھڑے ہوئے چھوٹے ہوئے

مرزا صاحب نے یوں داد دی کہ "داغ اس سے بہتر نہیں کہہ سکتا"

اسی طرح جناب سیماب صاحب کو انکے ایک استفسار پر یوں لکھا کہ "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے لیکن ہمارے یہاں حضور پیر و مرشد بادشاہ کو کہتے ہیں، معشوق کو نہیں کہتے لکھنؤ والے کچھ بھی کہیں ہم تو اپنی وضع نہیں چھوڑ سکتے" (حیات داغ صفحہ ۲ از سیماب) (حیات داغ صفحہ ۲ از سیماب اکبر آبادی)

خوب صورت و خوش نوا پرندوں کے پنجرے ٹنگے ہوئے تھے، یہ بچہ کنور صاحب ہی کا تھا اسے جو شرارت سوجھی جھٹ ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور بلبل کو باہر نکال کر ایک ڈورے سے اس کا پاؤں باندھ لیا اور لگے صاحبزادے اسے ہوا میں اڑانے، کنور صاحب صاحبزادے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے بڑے پرگو شاعر تھے، مجھے مخاطب کرکے بولے ع

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا

میں نے مصرع سنا فوراً دوسرا مصرع ذہن میں آگیا اور کنور صاحب سے کہا کہ لیجئے آپ کا پورا شعر ہو گیا ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

یکم جنوری ۱۹۰۲ء

ایک دوا رکھنے کے لئے مرزا صاحب کو آج کچھ بوتلوں کی ضرورت ہوئی، مرزا خورشید عالم نے کہا کہ بوتلیں میں حاضر کردوں گا، لہٰذا شام کو چار بوتلیں انہوں نے بھیجیں، بوتلیں بہت اچھی اور خوش رنگ تھیں مرزا صاحب کو بیحد پسند آئیں مگر ان پر شراب کی چٹیں لگی ہوئی تھیں، پوچھا کہ یہ بوتلیں کس چیز کی ہیں، جب معلوم ہوا[1] کہ یہ خوبصورت بوتلیں شراب کی

[1] اس روزنامچہ میں مرزا داغ کی شراب نوشی سے نفرت کرنے (باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

ہیں تو جو آدمی بوتلیں لایا تھا اس سے فرمایا گیا کہ ان کو واپس لے جاؤ، خورشید عالم سے کہہ دینا کہ خالی بوتلیں میں نہیں لیتا، بھر کر بھیجو تو لوں خالی خولی مجھے پسند نہیں، تھوڑی دیر کے بعد آدمی دوسری بوتلیں لیکر حاضر ہوا، مرزا صاحب نے جب پوری تحقیقات کر لی کہ یہ بوتلیں شراب کی نہیں ہیں تو انہیں لے لیا اور دوا رکھنے کیلئے ملازم کے حوالے کر دیا۔

٭٭٭٭٭٭

آج میر مردان علی جو دو ایک روز پہلے دورے سے لوٹے تھے مرزا صاحب سے ملنے آئے، ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے کہ اس دفعہ دورے میں ایک عجیب تجربہ ہوا، میں حیدرآباد کے ایک مقام "بھونگیر"[1] گیا ہوا

[1] بھونگیر دکن کا ایک قصبہ ہے جس میں ایک قدیم قلعہ ہے، اچھا قصبہ ہے اور تحصیل، ریلوے اسٹیشن بھی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۴۲) کے باب میں بعض روایات درج ہیں، ان تحریروں میں کچھ ایسے غلو سے کام لیا گیا ہے اور خاص اس باب میں کچھ ایسی خوش خیالیوں کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ معاملہ واضح ہونے کی بجائے مبہم و مشکوک ہو گیا ہے، مانا کہ مرزا داغ نے کبھی شراب نہیں پی اور انہیں طبعاً اس سے نفرت تھی لیکن داغ جس زندگی کے حامل تھے اور جس ماحول میں انکا اکثر وقت گزرا وہ اس کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ داغ شراب کے معاملے میں اتنے معصوم و ناواقف ہوں کہ انہیں شراب کی بوتلوں کی بھی پہچان نہ ہو اور وہ شراب کے مشہور و معروف ناموں سے بھی ناواقف محض رہے ہوں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ شراب نہ پیتے ہوں لیکن یہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا کہ وہ ان معمولی باتوں سے ناواقف تھے۔

تھا۔ ایک مکان میں شام کو کچھ عہدے دار جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اس کور دیہہ میں کوئی تفریح کا سامان ہونا چاہیئے ایک شخص نے بتایا کہ ایک تلنگنی طوائف آجکل یہاں ٹھہری ہوئی ہے حکم ہو تو بلا لیا جائے یاروں میں مشورہ ہوا اور اس کو بلا لیا گیا، مجرا شروع ہوا اس نے شروع میں دو ایک ٹھمریاں گائیں ، ٹھمریوں کے بعد غزلیں شروع ہوئیں اس نے متواتر تین غزلیں مرزا صاحب کی سنائیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس دور دراز مقام تک بھی مرزا صاحب کے کلام کی رسائی ہے اس واقعہ کو سن کر مولوی وددواحمد صاحب[1] تحصیلدار جو شریک محفل تھے بولے کہ مجھے مرزا صاحب کے کلام کی شہرت و مقبولیت کا اس سے زیادہ حیرتناک تجربہ ہوا ہے، سال گزشتہ میں دورے پر تھا ایک بیابان جنگل سے میرا گزر ہوا، اس نواح میں گونڈ قوم بستی ہے جو بالکل جاہل اور وحشی قوم ہے ، وہ لوگ جب کبھی خوش لباس شخص کو دیکھ لیتے ہیں تو ڈر کر بھاگ جاتے ہیں، اتفاق سے اسی قوم کا ایک شخص ایک بیل گاڑی ہانکتا ہوا میری بیل گاڑی کے قریب سے گزرا ، وہ کچھ گا رہا تھا، میں نے جب غور کیا تو وہ جاہل گونڈ مرزا صاحب کا یہ شعر الاپ رہا تھا ؎

---

[1] مرزا وددواحمد خاں تحصیلدار تھے بعد میں دوم تعلقدار ہو گئے تھے، ان کا اصل وطن دہلی تھا، ان کی ایک ہمشیر نواب لوہارو سے بیاہی تھیں، اس وجہ سے داغ کے خاندان سے عزیزدارانہ مراسم تھے، نواب منظور جنگ انہیں وددواحمد خاں صاحب کے فرزند تھے۔

عشق بھی اندوہ فزا ہو گیا
ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا

لیکن وہ اپنی زبان میں اس شعر کو اس طرح ادا کر رہا تھا ؎

عشق بھی اندوہ فجا ہو گیا
ہائے تبیرے تجھے کیا ہو گیا

وہ گنوار اس شعر کو ایسے مزے سے گا رہا تھا کہ مجھے بہت لطف آیا اور میں دیر تک مرزا صاحب کے اس شعر سے زیادہ اس گونڈ کے پڑھنے کے انداز سے لطف اٹھاتا رہا۔

رات کے نو بجے ہوں گے مرزا صاحب کے مکان کے برابر سے ایک برات کا جلوس گزرا، سب لوگ ادھر متوجہ ہو گئے، گلشن نامی ایک خادمہ اندر زنانخانے سے نکلی اور ایک طرف کھڑی ہو کر برات کا جلوس دیکھنے لگی، مرزا صاحب اسے دیکھ کر بولے کہ گلشن کیا دیکھ رہی ہو، گلشن نے اس شخص کی طرف جو دولھا بنا ہوا گھوڑے پر سوار تھا دیکھ کر جواب دیا کہ ,, اس شخص کو عمر قید ہوئی ہے اسی کو دیکھ رہی ہوں" مرزا صاحب بولے کیا بکتی ہے یہ ایک رئیس کا بیٹا ہے اور یہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ گلشن نے جواب دیا کہ میاں یہ سب سچ ہے مگر میں تو اسے عمر قید ہی کہوں گی، یہ کہہ کر گلشن تو اندر چلی گئی، مرزا صاحب بولے کہ یہ عورت نہایت شوخ و چنچل اور طرار ہے، فہم اس کا نہایت

اچھا ہے میں نے اس کا نام "فتنہ محشر" رکھا ہے، ایک روز مجھ سے بولی کہ مرزا صاحب آپ جانتے ہیں کہ آپ اتنے بڑے شاعر کیوں ہوئے، مرزا صاحب نے کہا کہ مجھے تو نہیں معلوم تم ہی بتاؤ اس نے کہا کہ جس نے وصل یار کے مزے چکھے ہوں، پیام و سلام کے لطف اڑائے ہوں، عشق کو اپنا دل پسند مشغلہ بنایا ہو، ہجر و فراق کی سختیاں جھیلی ہوں اور رقیبوں کے طعن و تشنیع سہے ہوں وہی شاعر ہو سکتا ہے ـــــ اور آپ ان باتوں میں طاق ہیں، مرزا صاحب بولے کہ مجھے اس عورت کی طباعی اور طراری پر بڑی حیرت ہوئی۔

آج مرزا صاحب بڑی دیر تک حضور نظام کی قدردانیوں اور مہربانیوں کا ذکر کر کے خدا کا شکر ادا کرتے رہے اور فرمانے لگے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ ایشیائی شاعری کا آسمان روشن ستاروں سے منور تھا، اب زمانے سے یہ صحبتیں مٹ رہی ہیں، نئی نئی بساطیں بچھائی جا رہی ہیں، انقلاب کا یہ حال ہے کہ بے چین طبیعت والوں کی طرح زمانہ کروٹیں بدلتا ہے ایک رنگ نہیں کھلنے پاتا کہ دوسرا جھلک جاتا ہے اس حال میں جو شخص بھی جسقدر مطمئن ہے وہ بہت خوش نصیب ہے، میں خدا کا صد ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے فکر معاش سے مجھے آزاد کر دیا ہے ورنہ اہل ہنر عموماً اور اہل سخن خصوصاً ہر ملک میں بدنصیبی اور بداختری کا شکار ہو رہے ہیں، میر انشاء،

سودا، غالب، مصحفی اور جرأت وغیرہ کی مثالیں پیش نظر ہیں سخن سنجوں کے ہجوم میں صرف معدودے چند ہی ایسے ملتے ہیں جو راحت کی بسر کر گئے ورنہ شاعری اور عسرت لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں مرزا صاحب اپنی موجودہ آسودہ زندگی سے واقعی بڑے مطمئن ہیں، ہر موقع و محل پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ان کی معاشی آسودگی و اطمینان کا یہ عالم ہے کہ ان کے اس زمانے کے کلام میں بھی عیش پسندی و آرام طلبی کے پورے پورے آثار پائے جاتے ہیں، انکے اس زمانہ کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کا وہ کلام جو حیدرآباد کی دنیا میں انہوں نے کہا نہ صرف پختگی و کہنہ مشقی پر دال ہے بلکہ اس میں پوری پوری آسودگی پائی جاتی ہے، بعض اشعار میں تو انہوں نے موجودہ عیش و تعیش کا علی الاعلان اظہار فرمایا ہے، اس نوع کے اشعار میں سے صرف ایک شعر سنئے ؎

اڑاتے ہیں مزے دنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو افضل گنج اپنی عیش منزل ہے

مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب میں حضور[1] کے ہمرکاب حج بیت اللہ کے لئے گیا تو یہ شعر میرے وردِ زبان تھا ؎

---

[1] داغ نے حج بیت اللہ نواب رام پور کے ساتھ کیا تھا۔

دیر سے کعبہ کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

مجھے اپنی خطاؤں اور اپنے معاصی کا جس قدر احساس اس موقع پر ہوا کبھی نہیں ہوا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فریضۂ حج کی ضرورت بھی اسی احساس کو بیدار کرنے کے لئے محسوس کی گئی ورنہ انسان اپنی تمام عمر غفلت و خفتگی میں گزار دیتا ہے اور اس کو اپنی کوتاہیوں اور اپنی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

فریضۂ حج کی ادائیگی میں یہ اندازہ بھی ہوا کہ یہی ایک وہ مقام ہے، جہاں امیر و غریب، بادشاہ اور گدا سب دوش بدوش ایک ہی ہیئت اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں، ہر شخص کو اپنے اعمال کے محاسبہ کا موقع ملتا ہے اور فردتنی و برتری کے تمام تصورات اس مقام پر دھندلے پڑ جاتے ہیں اور دل ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک فریضۂ حج کی آخری رسم ادا نہیں ہو جاتی ہے، اس کے بعد انسان ایک ایسے سکون اور ایک ایسے اطمینان سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جس کا لطف اگر وہ چاہے تو تمام عمر اٹھاتا رہے۔

۳ رجنوری ۱۹۰۲ء

مغرب سے کچھ قبل مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کچھ اور لوگ

بھی بیٹھے تھے، مجھ سے بولے کہ احسن ایک خط لکھ دو۔ میں خط لکھنے کے لئے مرزا صاحب کے پاس جا بیٹھا، مرزا صاحب حقہ پی رہے تھے، میرا روزہ تھا، مجھے حقے کے دھوئیں سے تکلیف سی ہوئی، میرے چہرے سے مرزا صاحب نے اس کا اندازہ کیا اور برجستہ یہ رباعی فرمائی:۔

احسن جلتے ہیں میرے حقہ سے بہت　　لگتی ہے انہیں آگ دیکھنے سے
روزے کے عوض توڑتے ہیں دل میرا　　لیتے ہیں گناہ دل توڑنے سے بہت

میں کچھ خفیف سا ہوا، بولے تمہارا استاد ۱۸۹۶ء تک روزوں کا بہت پابند تھا، کوئی روزہ نہ چھوڑتا تھا، لیکن اس ضعف پیری اور کبرسنی کا برا ہو کہ قویٰ مضمحل ہوگئے، روزے ٹوٹنے لگے یا یہ کہو کہ روزے رکھنے کی دل میں جگہ نہ رہی، اتنا فرما کر فی البدیہہ ایک رباعی ارشاد کی

وہ ضعف ہے دم سے نہیں نکلا جاتا　.:.　دنیا سے بھی اب تو نہیں اٹھا جاتا
گھر میں تو بہت طاق ہیں لیکن اے داغ　.:.　روزہ کہیں ہم سے نہیں رکھا جاتا

مرزا صاحب نے گو روزے رکھنا چھوڑ دیئے ہیں لیکن دنیا کے عام دستور کے مطابق بناوٹ کے وہ قائل نہیں، نہایت آزادی سے سب کے سامنے حقہ پیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک تو روزہ نہ رکھنا خود اپنی جگہ گناہ ہے اس پر روزہ داروں کی نقل کرنا اس سے زیادہ گناہ ہے، روزہ خدا کی خوشنودی یا اپنے نفس کے تزکیہ کے لئے رکھا جاتا ہے، بندے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے روزہ داروں کی سی شکل بنا کر بندوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، لیکن خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا اور اس طرح نہ اس کی خوشنودی

حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ اپنا ضمیر مطمئن اور نفس منزہ کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ کیا اصول ہے کہ خدا سے تو نہ ڈرا جائے لیکن بندوں سے خوف کیا جائے۔

مرزا صاحب کی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی زندگی کا بیشتر حصہ حسن و عشق کی رنگ رلیوں اور محبت و الفت کی سرگرمی سے ملوث ملے گا مرزا صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ یقیناً دوسرے تمام شعراء کے حالات سے مختلف تھا، وہ ایک نواب خاندان سے وابستہ تھے، بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کا زمانہ رئیسوں اور بادشاہوں میں گزارا اور بڑی حد تک انہیں کے زیر سایہ تربیت و پرورش پائی، مرزا داغ بلا شبہہ ۵ یا ۶ سال کی عمر سے ۱۴ سال کی عمر تک جیسا کہ وہ خود اکثر فرماتے رہتے ہیں، رؤسا رام پور کے زیر پرورش رہے ۱۴ سال کی عمر میں رام پور سے دہلی آئے اور قلعہ معلیٰ میں سکونت کی سعادت نصیب ہوئی اور شاہی الطاف و اکرام سے مالا مال رہے، مرزا صاحب سرحدِ جوانی میں قدم رکھنے سے قبل ہی ایک ایسی فضا میں پہنچ گئے جہاں کے حالات انسان کو قبل از وقت جوان بنا دیتے ہیں اور جوانی سے فائدہ اٹھانے کے پورے پورے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں اور فنِ عشق و محبت میں پوری پوری مہارت حاصل ہو جاتی ہے،

مرزا صاحب نے تقریباً اپنی عمر کے بیس سال ایسی فضا میں

بسر کئے، جو یکسر حسن و نغمات کی فضا تھی، جنسی جذبات کا احساس بھی مرزا صاحب کو شاہی قلعہ ہی میں ہوا اور ان جذبات کی خاطر خواہ تسکین بھی یقیناً قلعہ شاہی کی حدود ہی میں ہوتی رہی اور پھر چونکہ شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے، لہٰذا جب شاعری شروع کی تو انکی شاعری کا موضوع بھی رنگین تر ہی قرار پایا۔ وہ بھرپور جوانی میں رام پور پہنچے وہاں بھی عیش و نشاط کو کامران پایا۔[1] مرزا صاحب نے رامپور کی دنیا میں بھی خوب خوب دادِ حسن و عشق لی۔ رام پور ہی درحقیقت وہ مقام ہے جہاں مرزا صاحب کے جذبۂ عشق و الفت کے سب کس بل نکلے اور وہ درحقیقت سانچے میں ڈھل گئے۔ "حیاتِ داغ" کا وہ باب جس کا تعلق منی بائی حجاب کی محبت و گرویدگی سے ہے یہیں وا ہوا اس کی چسک رام پور ہی میں پڑی اور داغ بازی گاہ عشق و محبت کے ایک چابک دست شہسوار متصور کئے جانے لگے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں نے اپنی جدت پسند طبیعت سے جہاں ریاست رام پور میں اور صدہا خوبیاں پیدا کیں، وہیں شہر کی آرائش و زیبائش کی طرف بھی ان کا ہمیشہ دھیان رہا، اس فراخ دل رئیس نے رامپور جیسی چھوٹی سی ریاست کو مختلف طریقوں

---

[1] اس زمانے میں دربار رام پور سے وابستہ طوائفوں میں محبوب جان، اللہ رکھی، لذت بخش، جنو، ممی، ننھی، عباسی، عزیزن، ہنگنا جان، بندی جان، امیر جان، امامی جان وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

سے سنوارا تھا، انہوں نے صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی دینے کے پیش نظر مارچ ۱۸۸۶ء میں ایک "میلہ" لگوایا جو مارچ کے آخری ہفتے سے شروع ہو کر مہینہ کے خاتمے پر ختم ہو جاتا تھا، یہ میلہ جس باغ میں لگتا تھا اس کا نام بے نظیر تھا، اس باغ کی مناسبت سے اس میلے کا نام بھی "میلۂ بے نظیر" رکھدیا گیا، نواب خلد آشیاں کی جدت پسند طبیعت نے اس میلے میں بڑی جاذب توجہ خوبیاں پیدا کردی تھیں، گو اس زمانے میں رام پور تک ریل نہیں تھی بایں ہمہ اطراف ہند کے ہزاروں تاجر اس میلے میں اکھٹے ہو جایا کرتے اور میلے کی رونق میں اضافہ کرتے تھے، میلے کی آرائش و زیبائش کے سلسلے میں علاوہ دکانوں وغیرہ کے، دہلی، کلکتہ، بنارس اور لکھنؤ وغیرہ کی مشہور طوائفیں اور فنکار بھی جمع ہو جایا کرتے تھے چنانچہ ۱۸۷۹ء کے میلہ میں کلکتہ سے ایک طوائف منی بائی حجاب تشریف لائیں اور مرزا صاحب انہیں دل دے بیٹھے، منی بائی حجاب حیدر علی خاں برادر خرد نواب خلد آشیاں کی طلب کی ہوئی رام پور پہنچی تھیں، مرزا داغ کے نواب صاحب سے مراسم خصوصی تھے اس لئے اس وقت کھل کر اظہار عشق نہ کر سکے، حجاب میلہ کرکے کلکتہ واپس گئیں لیکن مرزا صاحب کی محبت و گرویدگی چھپ نہ سکی اور نواب صاحب کو اس کا پتہ

ا؎ حیدر علی خاں رام پور سے ترک سکونت کرکے قصبہ لسی ضلع بدایوں آرہے تھے جہاں ان کی بڑی جاگیر تھی۔

چل گیا چنانچہ دوسرے سال جب میلہ ہوا تو مرزا صاحب نے حجاب کو میلے میں شرکت کی دعوت دی لیکن صاحبزادہ صاحب کی بے التفاتی دیکھ کر حجاب نے مرزا صاحب کو لکھا کہ وہ انکے بلائے بغیر نہ آسکیں گی، مرزا داغ نے نواب حیدر علی خاں سے کہا اور ان پر اس حد تک زور ڈالا کہ انہوں نے حجاب کو دعوت نامہ بھجوا دیا حجاب تشریف لائیں اور حیدر علی خاں صاحب کے یہاں ہی بطور مہمان قیام فرمایا لیکن دلوں میں گانٹھ پڑ چکی تھی، نیز مرزا صاحب سے حجاب کی محبت کا سلسلہ جاری تھا، نواب صاحب نے منی بائی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ حجاب خفا ہو کر مرزا داغ کے یہاں اٹھ آئیں اور دو ماہ ان کی مہمان رہ کر اور دادِ عیش لے کر کلکتے واپس ہو گئیں، چلتے چلتے داغ صاحب کو کلکتے آنے کی دعوت دے گئیں، یہ اصرار کلکتہ پہنچکر اور بڑھ گیا اور داغ صاحب کی طلبی کے خطوط زور و شور سے آنے لگے، مرزا صاحب کو ریاست کی خدمات سے ہی نجات نہیں تھی سال بھر تک بہ لطائف الحیل ٹالتے رہے اور وعدہ پورا نہ کر سکے، کلکتے کے رقیبوں نے حجاب کو سمجھایا کہ داغ صاحب کو تم سے ذرا بھی محبت نہیں ورنہ وہ اس قدر طلب و تقاضے پر رک ہی نہیں سکتے تھے، یہ چیز جب حجاب کے ذہن نشین ہو گئی تو انہوں نے طلبی کے معاملے میں اور زیادہ ضد اور شروع کر دی۔ ان کے زبردست اصرار سے مجبور ہو کر اپریل ۱۸۸۲ء میں مرزا صاحب رامپور سے بعزم سفر کلکتہ روانہ

ہوئے اور دہلی، کانپور، لکھنؤ، الہ آباد اور پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے، میر قطب الدین[1] اشک ہمرکاب تھے، کلکتہ کے اس سفر میں ڈھائی تین ماہ صرف کرکے ۱۶ر جولائی ۱۸۸۲ء کو واپس رامپور پہنچے ـــ اور کلکتے سے منی بائی حجاب کے دردِ عشق سے اس حد تک متاثر آئے کہ حسن و عشق کی اس داستان کو ایک مثنوی کی شکل میں قلم بند کیا جو مثنوی فریادِ داغ

---

[1] میر قطب الدین نام اور پیر جی عرف تھا۔ ان کے والد سید علیم الدین عرف میاں میتا کا سلسلہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے، چند پشتوں سے ان کے اجداد قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے مگر انکے والد سید علیم الدین نے دہلی میں سکونت اختیار کی چنانچہ میر قطب الدین یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، شاعری کا ذوق شروع سے تھا، اشک تخلص کرتے تھے ابتدائی صلاح فن شعر میں اپنے ماموں میر عباس سے لکھنؤ میں لی پھر دہلی آکر خاقانی ہند جناب ذوق سے رجوع ہوئے، ظہیر دہلوی کے بھائی امراؤ مرزا انور سے بھی فیض اٹھایا، آخر میں حضرت داغ سے رجوع ہوئے، یہ نہ صرف داغ کے شاگرد تھے بلکہ داغ کے مخلص ترین دوستوں میں شمار ہوتے تھے، سالہا سال سفر و حضر میں مرزا صاحب کے ساتھ بطور دمساز و ہمراز رہے۔ کلکتہ کے سفر میں جناب اشک جس دلسوزی کے ساتھ مرزا صاحب کے شریک حال رہے اس کا اندازہ مرزا صاحب کے اس شعر سے فرمائیے ؎

میرے ہمراہ میر قطب الدین — اشک ریزاں بحالت غمگیں الخ

حیدر آباد بھی ایک عرصہ تک مرزا صاحب کے پاس رہے اور داد رفاقت پاتے رہے

کے نام سے شہرت رکھتی تھی۔

آخر عمر میں مرزا صاحب حیدرآباد پہونچے، یہاں کے حالات نے ایسا ساتھ دیا کہ وہی مرزا داغ جو دلّی و رامپور میں اپنے جوش جوانی کے بل بوتے پر محبت کی بازی لگایا کرتے تھے حیدرآباد پہنچکر شاہدان بازاری کے التفات کو اپنے پیسے کے زور سے خریدنے کے لائق ہو گئے، چنانچہ مرزا صاحب کی زندگی کی اس مختصر روئداد میں جس کا تعلق یکسر حیدرآباد کی زندگی سے ہے متعدد صورتیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو محض پیسے کے زور سے مرزا صاحب سے لگی لپٹی رہیں۔

حیدرآباد کے قیام میں جیسا کہ معلوم ہوا اور خود بھی دیکھا مرزا صاحب نے دو تین طوائفیں یکے بادیگرے ملازم رکھیں ان کی نوکری صرف اتنی رہی کہ دوسرے تیسرے روز یا جب بھی طلب ہوں گانا سنا دیا کریں، ایسی ملازم طوائفوں میں ایک نام صاحب جان کا ملتا ہے جو آگرے کی رہنے والی تھی، شکل و صورت تو واجبی ہی تھی لیکن بڑی حاضر جواب، علم مجلسی میں طاق اور گانے میں ماہر تھی، عمدہ جان جو میرٹھ کی رہنے والی تھی ایک عرصے تک مرزا صاحب کی ملازم رہی، نہایت شکیل، برجستہ گو تھی اگانی بھی کمال کا تھی اس پیشے سے تائب ہو کر کسی سے نکاح کر لیا، آجکل اختر جان دو سو روپیہ پر ملازم ہے، یہ بہت نو عمر اور حسین طوائف ہے، مرزا صاحب کی عمر واقعی اب اس قابل نہیں کہ وہ حسن و جمال کی عملاً پذیرائی فرما سکیں یہ صرف سابقہ ماحول کے اثرات اور ان کی جبلّ کا اقتضا ہے کہ وہ اس

عمر میں بھی وضعداری ترک نہیں فرماتے، تعیش پسندی ان کی فطرتِ ثانیہ ہو چکی ہے، ان کی طبیعت میں تاک جھانک کی لپک اب تک موجود ہے بعض حالات کے ماتحت تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرزا صاحب کی روح خاص اس معاملے میں بڑی بے چین اور دارفتہ رہیگی جس کی پیشین گوئی وہ خود بھی اس طرح فرما چکے ہیں ؎

محشر میں بعد پرسشِ اعمال دیکھنا
ہم دیکھتے پھریں گے تماشا ادھر ادھر

ـــــــــــــــ

۵ رجنوری ۱۹۰۲ء

آج ایک بڈھی کھوسٹ طوائف جو عرصہ سے حیدرآباد میں وارد تھی مرزا صاحب کے سلام کو آئی، مرزا صاحب نے اس کا مکان پوچھا باتوں باتوں میں کہنے لگی کہ مجھے آپ بھول گئے، برسوں آپ سے تعلق رہا، مرزا صاحب کہنے لگے قسم کھاتا ہوں کہ آج سے پہلے تیری صورت بھی دیکھی ہو اور تو کہتی ہے میرا تجھ سے تعلق رہا، بڑی دیر تک مرزا صاحب اس طوائف سے ہنسی مذاق کرتے رہے، اس طوائف[ا] سے پوچھا کہ کچھ

[ا] روزنامچے کا یہ حصہ رسالہ نگار بابت ماہ اگست ۱۹۴۸ء میں میرے مضمون، "داغ اور منی بائی" میں شامل نہ ہو سکا جس کی وجہ بجز اس کے دوسری نہیں کہ مسودے کی رواں عبارت اور کاغذ کی بوسیدگی کی بنا پر یہ تحریر اس وقت پڑھنے میں نہ آسکی اور مجبوراً ترک کرنا پڑی۔

گانا بھی آتا ہے یا وہ بھی بھول گئیں، طوالف مسکرائی اور اس نے برجستہ مرزا صاحب کی یہ غزل سنائی :-

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
جب ترے در سے پھرا خلقت تماشائی ہوئی — پیچھے پیچھے داغ آگے آگے رسوائی ہوئی
جان کر پہچان کر انجان جب کوئی بنے — پھر نہ ہونے کے برابر وہ شناسائی ہوئی
مجکو یہ دعویٰ کوئی تیرے سوا ملتا نہیں — اس کا یہ الزام اچھی قید تنہائی ہوئی

چلدیا اے داغ کیا منہ پھیر کر وہ مہ جبیں
پھر گئی تقدیر میرے سامنے آئی ہوئی

مرزا صاحب کے ایک ملازم کا نام "جمال" ہے، حقہ برداری اس کا مخصوص کام ہے، افیون بہت کھاتا ہے، ہر وقت انگیٹھی میں آگ روشن رہتی ہے اور اس پر چار کی دیگچی چڑھی رہتی ہے، مرزا صاحب نے آج اس کی انگیٹھی دیکھ کر فرمایا کہ "یہ آگ بہرام گور کی جلائی ہوئی ہے جو کبھی نہ بجھیگی"۔

مشہور ہے کہ جب بہرام گور ہندوستان سے بخیریت تمام ایران پہونچا تو اسنے ہندوستان سے بخیر وخوبی واپسی کی خوشی میں جشن منایا، اپنے عقائد کے مطابق آگ روشن کرائی اس آتشکدے میں رات دن میں ۵ دفعہ لکڑیاں ڈالی جاتی تھیں جو صندل یا دوسرے خوشبودار درختوں کی ہوتی تھیں، حکم تھا کہ یہ آگ کسی وقت نہ بجھنے پائے چنانچہ بہرام گور ختم ہو چکا دنیا صدہا انقلاب کی شکار ہو چکی، بارہ سو سال سے زیادہ گزر چکے، لیکن

بہرام گور کی جلوائی ہوئی آگ آجتک روشن ہے ــــ میرا خیال ہے کہ میاں جمال کی جلائی ہوئی آگ اس وقت ۲۴ گھنٹے جلتی ہے، ان کے بعد بھی شاید بدستور جلتی رہے ــــ،،

---

۶ / جنوری سنہ ۱۹۰۲ء

۲۷ / دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء سے ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء تک مدراس میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے تھے، شرکاء کانفرنس میں دور دور سے شرکت کیلئے وہاں پہونچے تھے، کچھ لوگ حیدرآباد صرف مرزا صاحب کی زیارت کی غرض سے بھی تشریف لائے، چنانچہ ڈاکٹر غلام نبی لاہور کے مشہور حکیم جو زبدۃ الحکماء کے خطاب سے معروف ہیں، شیخ عبدالقادر بی اے پنجاب آبزرور کے اڈیٹر اور مولوی محمود علی بی اے وغیرہ مرزا صاحب کی زیارت کے لئے قبل انعقاد کانفرنس حیدرآباد آچکے تھے، آج مولوی بشیرالدین اڈیٹر اخبار "البشیر" اٹاوہ، واحد حسین ساکن ہمیرپور، اور حاجی صاحب[1] اور نواب سنہ ۱۸۹۱ء جو شرکت کانفرنس کے لئے مدراس گئے ہوئے تھے آج حیدرآباد وارد ہوئے اور ۹ بجے کے قریب مجھے ڈھونڈنے نکلے مجھ سے جب ملاقات ہوئی تو فصیح الملک مرزا داغ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، میں انہیں لے کر مرزا صاحب کے یہاں پہنچا،

---

[1] حاجی صاحب اور نواب سنہ ۱۸۹۱ء کے متعلق نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کون بزرگ تھے غالباً مارہرہ کے وہ لوگ تھے جنہیں یہ خطاب برنبائے بے تکلفی دیئے گئے تھے

اور انہیں باہر چھوڑ کر مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور ان لوگوں کی حاضری کا ذکر کیا، مرزا صاحب نے پوچھا یہ کون صاحبان ہیں، میں نے بتایا کہ دو صاحب تو مارہرے کے ہیں، ایک اٹاوے کے ہیں اور چوتھے ہمیرپور کے واجد حسین ہیں جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تعلیم پاتے ہیں، یہ سن کر فرمایا، بسم اللہ انہیں میرے پاس لائیے، چند منٹ کے بعد میں ان لوگوں کو جو باہر منتظر تھے لیکر مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچا سب سے بغلگیر ہو کر ملے، ہر ایک کا نام پوچھا، حیدرآباد آنے کا سبب دریافت کیا، سب نے یہی جواب دیا کہ آپ کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں ہنس کر بولے کہ میں بڈھا آدمی ہوں ایک شخص کا بار "احسان" اٹھا سکتا ہوں دو کا اٹھا سکتا ہوں، چار چار کی مہربانیوں کا بوجھ کیسے اٹھاؤں، میری تو گردن ٹوٹی جا رہی ہے، یہ فرما کر اپنی عادت کے مطابق فی البدیہہ یہ قطعہ فرمایا:-

بجکم مہِ صیام میں ہے عید کی خوشی ملنے کو میرے آئے ہیں اصحاب باوفا
یہ داغ کی دعا ہے کہ چاروں مرے حبیب اپنی مراد پائیں بحق چہار یار

ان مشتاقوں نے حضرت سے کہا کہ ہماری ایک آرزو اور بھی تھی اور وہ یہ کہ آپ کا کلام آپ کی زبان سے سننے کی عزت حاصل کرتے، مہمانوں کی دلشکنی منظور نہ ہوئی مرزا صاحب نے دو غزلیں[1] سنائیں اس کے بعد

---

[1] مرزا صاحب نے جو غزلیں سنائیں ان میں سے پہلی غزل کا مطلع یہ تھا ؎

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں، اڈیٹر البشیر نے ایک غزل کی نقل بھی لی اور کہا کہ آپ سے ملاقات کی یادگار میں یہ غزل میں اپنے اخبار "البشیر" میں شائع کرونگا۔

آج مرزا صاحب کی ڈاک آئی تو مجھے حسب معمول حکم ہوا کہ خطوط پڑھو رام پور سے شبّر علی خاںؔ عرف دولھا کا ایک خط میں نے پڑھا، جس میں مادۂ تاریخ کی فرمائش تھی اور جلد از جلد بھیجنے کا اصرار تھا، وہ خط ختم کر کے بمشکل میں دوسرے خط کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ مرزا صاحب بولے کہ اس خط کے ایک گوشے پر "شبّیر علی خاں دولھا" لکھ دو میں نے پوچھا کہ اس نام کا تو یہ خط ہی ہے پھر یہی نام اس پر درج کرانا کیا معنی رکھتا ہے، بولے اس نام کے اعداد تو نکالو، میں نے اعداد نکالے تو پورے ۱۳۱۹ اعداد سال ہجری کے نکلے، مرزا صاحب بولے یادداشت قلم بند کر لو، قطعہ تاریخ کسی وقت کہہ دوں گا، مجھے یہ دیکھ کر مرزا صاحب کی تاریخ گوئی کی مہارت پر بہت تعجب ہوا ———،

ؔ شبیر علی خاں صاحبزادہ حیدر علی خاں کے بھائی تھے اور نواب حیدر علی خاں کا تعلق نسلی نواب رام پور سے تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۹) دوسری غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں ۔۔۔ زندگی کا کوئی حساب نہیں

۸ر جنوری ۱۹۰۲ء

آج منی بائی حجاب کا ایک خط آیا اسے پڑھ کر مرزا صاحب بولے کہ حجاب خط میں یہ عہد فرما رہی ہیں کہ جب تک نکاح نہ کرو گے تمہارے سامنے نہیں آؤں گی، میں نے یہ تمام جھگڑے اسلئے نہیں کئے ہیں کہ شرعی باتوں سے قطع نظر کر لوں تم اس بھروسہ میں نہ رہنا کہ تمہارے سامنے آجاؤں میرے لئے علیحدہ مکان لینا اسی میں اترونگی اور جب تک قاضی نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت تک تم میری صورت دیکھنے کے مجاز نہ ہوگے اتنا کہہ کر مرزا صاحب بولے کہ بہت اچھا، ایسی دھجیاں اڑائی ہوں کہ وہ خوب یاد کریں، بے تکلف حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ دیکھو بھائی جب وہ تشریف لائیں تو مجھ کو ایسی جگہ چھپانا کہ وہ اگر ڈھونڈیں بھی تو نہ پائیں مگر حجاب ایک جلتی ہوئی عورت ہے مجھے تو یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری عورت اس پردے میں مجھ سے نکاح نہ پڑھوا لے انہوں نے جب مجھ سے شرط کی ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوگا اس وقت تک میں سامنے نہیں آؤنگی تو میں کیسے جان سکتا ہوں کہ میری بیوی منی بائی حجاب ہی بنیگی، اس لئے مناسب یہ ہے کہ جب تک وہ یہاں حیدر آباد میں کھچوایا ہوا فوٹو نہیں پیش کریں اس وقت تک نکاح نہیں ہو سکتا۔

۱۰ر جنوری ۱۹۰۲ء

اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن میر محبوب علی خاں بہادر کی جب غزل

اصلاح کے لئے آتی ہے تو بند لفافے میں آتی ہے مرزا صاحب خود لفافہ کھولتے ہیں: اسی وقت اصلاح دیکر اور لفافہ بند کر کے واپس کر دیتے ہیں، آج مرزا صاحب نے بتایا کہ پچھلے ہفتے حضور بندگان عالی کی جو غزل اصلاح کے لئے آئی تھی اس کے ایک شعر میں ایک جگہ لفظ "وسکی" آیا تھا میں نے خیال کیا کہ قدما "اس کی" کی جگہ "وسکی" استعمال کیا کرتے تھے، لہذا میں نے وسکی کو اسکی سے بدل دیا اور شعر موزوں کر دیا لیکن جب حضور میں پہنچا تو اعلیٰحضرت نے وہ اصلاح مجھے دکھا کر پوچھا کہ آپ نے یہ کیا اصلاح دی ہے، میں نے جو اصلاح دی تھی نہایت سادہ لوحی سے اس کا ذکر کر دیا، اعلیٰحضرت ہنس کر بولے کہ "یہ نہ پینے کی خوبی ہے" ان کے اس جملے پر میں سمجھا کہ وہ لفظ درحقیقت وسکی تھا جو ایک انگریزی شراب کا نام ہے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ لفظ وسکی شعر میں اس طرح موزوں ہو گیا تھا کہ میں مطلق نہ سمجھ سکا کہ اس سے مراد وسکی شراب ہے، گو مجھے شراب سے طبعاً نفرت ہے اور جب کبھی شراب کا ذکر ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میرے گولی مار دی، لیکن عام معلومات کے تحت میں یہ بھی جانتا ہوں کہ "وسکی" ایک شراب کا بھی نام ہے مگر اعلیٰحضرت نے کچھ ایسی مناسبت سے یہ لفظ استعمال کیا تھا کہ ادھر میرا ذہن ہی منتقل نہیں ہوا۔ اور میری اصلاح سے ایک مزاح کی صورت پیدا ہو گئی

آج میں جب مرزا صاحب کے پاس پہونچا تو وہ بڑے پر کیف انداز میں کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت یہ کون شعر گنگنا رہے ہیں، ہنسے اور بولے کہ تم بھی سن لو اور میر درد کا یہ قطعہ سنایا:۔

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے — مذکور کسی طرح کا جا کیجئے اس سے

سو بار یوں ہی ٹھہر چکی اب کے نہ ملئے — یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

جوں جوں وہ رکے ہے تو یہی آوے ہے جی میں — پھر چھیڑیئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے

ہم درد میاں کہتے نہ تھے چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

آج خانساماں ابراہیم علی کے یہاں مشاعرہ ہوا، طرح یہ تھی ع

ماہِ نو کی طرح ہیں لب روشن

یہ مصرع اعلیحضرت کا عطیہ تھا، مرزا صاحب نے بھی مشاعرے میں شرکت فرمائی تھی، آخر میں جب ان کے پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو فرمایا کہ بادشاہ کی غزل پر تو میں غزل نہیں کہہ سکا، غیر طرحی غزل عرض کرتا ہوں، چنانچہ انہوں نے دوسری غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نشان داغ سخنور کی قبر کا ہے یہی
بجائے سبزہ زمیں سے زباں نکلتی ہے

مشاعرے کے خاتمے پر خانساماں صاحب نے مرزا صاحب کی غزل یہ کہہ کر لے لی کہ ولی عہد بہادر کا حکم ہے کہ مرزا صاحب جو غزل سنائیں

وہ ان سے لے لینا، میں نے واپسی پر مرزا صاحب سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ولی عہد بہادر کو بھی ذوقِ سخن ہے، وہ میری ہر غزل کے مشتاق رہتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلوں کی نقول وہ حاصل کر چکے ہیں

اسی مشاعرے میں ایک ہنگامہ بھی ہو گیا: مرزا خورشید عالم نے جب اپنی غزل پڑھی تو غزل سے پہلے دو شعر حاضرین کو سنائے، پہلا شعر تھا ؎

زبانِ[1] لکھنؤ دلی سے اچھی ہماری بلی اور میاؤں ہمیں سے

دوسرا شعر تھا ؎

لوگ کہتے ہیں بنا دلی بگڑ کر لکھنؤ پر کہاں ممکن ہے اس اجڑے ہوئے گھر کا جواب

لکھنؤ کے اکثر شعراء اور دوسرے افراد مشاعرے میں موجود تھے، ان اشعار کو سن کر بگڑ گئے اور تو تو میں میں شروع ہو گئی، لیکن بعض لوگوں نے افہام و تفہیم سے بات کو دبا دیا اور ہنگامہ رفع دفع ہو گیا، لیکن اس عمل سے مشاعرے میں بے لطفی سی پیدا ہو گئی جو آخر وقت تک قائم رہی۔

---

[1] لکھنؤ والوں کی ہجو میں ایک شعر یہ بھی مشہور ہے ؎

دلی کے لوگ لکھنؤ والوں کے سامنے ایسے ہیں جیسے شیر غزالوں کے سامنے

مرزا صاحب کا قاعدہ ہے کہ اکثر صبح ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک اور شام کے ۵ بجے سے آٹھ نو بجے تک بشرط فرصت تلامذہ کی غزلوں پر اصلاح کے لئے بھی کچھ وقت نکالتے ہیں ورنہ عام طور سے یہ وقت تفریح کے لئے مخصوص ہے، قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص غزل سناتا ہے، شعر سن کر اچھا ہوا تو "ہوں" کر دیا اور اگر اصلاح کی ضرورت ہوئی تو کہا "کیا" پڑھنے والے نے دوبارہ شعر پڑھا اور مرزا صاحب نے اسی وقت الفاظ کو الٹ پھیر کر یا رد و بدل کر کے اصلاح دیدی، اصلاح دیدینے کے بعد "ہوں" کہتے اس آواز کے ساتھ ہی پڑھنے والا دوسرا شعر پڑھتا، ایک غزل کی اصلاح میں اگر کوئی الجھن پیدا نہ ہو تو ایک دو منٹ فی شعر سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا ہے، اصلاح کرتے وقت مرزا صاحب اپنا پورا شعر یا مصرع کبھی نہیں دیا کرتے، ایک آدھ لفظ کی اگر غلطی ہوتی ہے تو بنوا دیتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ پورا شعر یا مصرع بنوا دیں بلکہ پورا مصرع یا شعر غلط ہوتا ہے تو وہ قلم زد کر دیا جاتا ہے، بحالت موجودہ یہ طریقہ مقرر ہے کہ مجکو یا احسن کو اصلاح کے لئے غزل دیا کرتے ہیں، کبھی کبھی ہم لوگ بھی اپنی سمجھ کے مطابق کوئی لفظ بتا دیا کرتے ہیں جس کی ہمیں اجازت ہے اگر وہ لفظ اچھا ہوتا ہے تو بے تکلف اسے لکھا دیا کرتے ہیں اس معاملہ میں مرزا صاحب اتنے فراخ حوصلہ ہیں کہ جب کبھی اپنی غزل کہتے ہیں کوئی لفظ کھٹکتا ہے تو پوچھتے ہیں ہم ادب کی وجہ سے زبان بند رکھتے ہیں مگر وہ اس پر خفا ہوتے ہیں اور

فرماتے ہیں کہ جب کوئی لفظ کھٹکے بے تکلف بتادو، میں فرشتہ نہیں ہوں، انسان ہوں، ممکن ہے کہ تمہارے خیال میں کوئی اچھا لفظ آجائے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ فصیح اللغات کے لئے احسن مثالیہ اشعار کہلوا رہے تھے، احسن نے عرض کی کہ حضرت "بات چیت" کو نظم فرما دیجئے احسن کا یہ کہنا تھا کہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ع

بات چیت ان سے اب نہیں ہوتی

استاد نے دوسرا مصرع فوراً فرما دیا اور یوں شعر ہو گیا ؎

ہم بھی کچھ کہتے وہ بھی کچھ کہتے
بات چیت ان سے اب نہیں ہوتی

یہ شعر احسن نے لکھ لیا اور یادگارِ داغ کے مسودے پر بھی درج ہو گیا لوگ کچھ سمجھیں مجھے اس کی پروا نہیں میں انکی طبیعت کا اندازہ کرنے کے لئے اسے ظاہر کرنا چاہتا اور بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی شخص کے نیک مشورے کو کس طرح قبول کر لیا کرتے تھے۔

آج مستجاب خاں صاحب خلقؔ جب پہنچے تو مرزا صاحب عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، وہ مرزا صاحب کو نماز پڑھتے دیکھ کر جانے لگے مرزا صاحب نے سلام پھیرا تو وہ سامنے جاتے ہوئے نظر آئے، مجھے

اشارہ ہوا کہ انہیں بلا لوں، میں نے خلق کو آواز دی، وہ لوٹ آئے مرزا صاحب نماز سے فارغ ہو کر ان سے بولے کہ میاں کہاں آئے اور کہاں واپس چلے، خلق نے جواب دیا کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے میں واپس ہو رہا تھا، مرزا صاحب ہنسے اور بولے کہ بھائی میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا، لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا، شیطان تو بھائی لاحول پڑھنے سے بھاگتا ہے، نماز پڑھنے سے کیوں بھاگنے لگے۔

مرزا صاحب کی اس لطیفہ گوئی سے حاضرین نے بہت لطف اٹھایا اور خلق جھینپ کر رہ گئے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۰۲ء

دو چار دن ہوئے منی بائی کا جو خط آیا تھا اس میں وہ لکھتی ہیں کہ:-

حاجی صاحب زاد لطفہٗ

بعد آداب کے عرض رسا ہوں کہ خط آپ کا ملا، خیریت ملی، میرا آنا تو قطعی ہے لیکن جب تک نکاح نہیں کروں گی تمہارے سامنے نہیں آؤنگی، میں نے یہ تمام جھگڑے اس لئے نہیں کئے ہیں کہ میں شرعی باتوں کے خلاف کروں، تم اس بھروسے میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آؤں، میرے لئے علیحدہ مکان لینا میں اسی میں اترونگی اور جبتک قاضی صاحب

نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت تک تم میری صورت
دیکھنے کے مجاز نہیں ہو.........!

خط سن کر مرزا صاحب بولے کہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ منی بائی صوم وصلوٰۃ کی بڑی پابند ہو گئی ہیں، خلاف شرع تھوکنا بھی نہیں پسند کرتی ہیں، ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں اگر یہی حال رہا تو بہت جلد پوری مجذوب ہو جائیں گی۔ بھائی انکے لئے ایک جانماز اور ایک تسبیح تیار رکھو جس وقت وہ یہاں اتریں فوراً یہ چیزیں ان کی نذر کی جائیں۔

۱۷ر جنوری ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب شاہی اسٹاف میں شریک ہیں اس لئے وہ اکثر اعلیٰحضرت کے ساتھ سفر و حضر میں موجود رہتے ہیں دربار کی روزانہ حاضری انکے لئے لازمی نہیں، شاہی اسٹاف میں جناب داغ کو خاص درجہ اور عزت حاصل ہے، اعلیٰ حضرت بھی مرزا صاحب کا بہت خیال رکھتے ہیں، آج مرزا صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ حضور نظام مجھ سے کھڑے باتیں کر رہے تھے ان کی عادت ہے کہ جب وہ باتوں میں مصروف ہوتے ہیں تو گھنٹوں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں آداب شاہی کا تقاضہ ہوتا ہے کہ مخاطب بھی مودب اسی حال میں حاضر رہے، میں تقریباً ایک گھنٹے تک تو اس صورت کو

برداشت کرتا رہا اور جس طرح ممکن ہوا کھڑا رہا، اعلیحضرت باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں میرے اس حال کا ذرا اندازہ نہیں ہوا بالآخر جب میرے لئے اور زیادہ دیر کھڑا رہنا ناقابل برداشت ہوگیا تو مجھے چکر آگیا اور میں گر پڑا میرے گرنے پر اعلیحضرت کو احساس ہوا اور انھوں نے اسی وقت مجھے بیٹھنے کی اجازت دیدی اور ازراہ الطاف خسروانہ اجازت ہوئی کہ میں کسی حال میں رہوں آپ جس وقت چاہیں بیٹھ سکتے ہیں، میرے اس اعزاز پر بعض لوگوں کو بڑی حسد ہے، اور بہت رشک ہے چنانچہ گرامی[1] جو درباری شاعر ہیں انہیں بھی میرے اس اعزاز پر سخت ناگواری ہے، جس کا اظہار وہ اکثر کرتے رہے۔ مجھے خود بعض اوقات

---

[1] اُن کا پورا نام غلام قادر اور گرامی تخلص تھا، ترک علی شاہ قلندر کے برادر نسبتی تھے، فارسی میں اچھا درک تھا، رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر میں گرامی و داغ سے متعلق ایک پر لطف واقعہ درج ہے۔ آپ بھی سن لیجئے:-

"دکن میں مولانا گرامی کم وبیش ۲۵ برس رہے اس تمام عرصے نہ صرف انہیں دربار میں کامل اثر ورسوخ حاصل تھا بلکہ نظام کے مزاج میں بھی دخل ہوگیا تھا، ایک دفعہ بہاریہ قصیدے پر اس قدر انعام ملا کہ داغ حسد کرنے لگے، داغ استادِ شاہ تھے اور گرامی کی حیثیت دربار دکن میں شاعر خاص کی تھی اس طرح دونوں کا میدان، جداگانہ نوعیت کا تھا اور دونوں کی فکر سخن کی لسانی کی حدود بھی ایکدوسرے سے مختلف تھیں تاہم رامپوری چشمکوں کا سلسلہ ازسر نو شروع ہوگیا

(باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

اس تخصیص کا احساس ہوتا ہے خصوصاً ایسے حالات میں کہ خود اعلیٰحضرت کھڑے ہوں، چنانچہ میں نے اپنا معمول بنالیا ہے کہ حد برداشت تک تو میں اعلیٰ حضرت کے سامنے کھڑا رہتا ہوں، جس وقت زیادہ کھڑا

(بقیہ صفحہ ۱۶۹) ایک دن داغ نے نظام کی خدمت میں بہ سبیل غیبت کہا کہ یہ شخص شعر کیا خاک کہے گا، شاید کہیں سے قلمی دواوین ہاتھ آگئے ہیں اب اپنے نام سے پڑھتا پھرتا ہے، عبدالحلیم شرر نے یہ بات گرامی تک پہنچائی کہ داغ نے دربار میں یوں کہا، ادھر کیا دیر تھی گرامی نے داغ کی ہجو کہی اور دوسرے دن بر سر دربار پڑھ دی داغ جل بھن کر خاک ہو گئے اور درشت کلامی تک نوبت پہونچی، گرامی نے کہا بھلا میں شعر کہنا کیا جانوں یہ بھی کسی پرانے استاد کا غیر مطبوعہ کلام ہوگا نظام نے اس تکرار کو یہ کہہ کر بند کرا دیا کہ دونوں حضوری ہو، باہم فیصلہ کرلو۔ بہت دنوں میں داغ کو اپنی خفیف حرکت کا احساس ہوا اور دونوں باکمالوں میں باہم صلح ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرلیا، دیوان گرامی میں داغ کی توصیف میں ایک مثنوی شامل ہے جس کے آخری تین شعر یہ ہیں:-

حقیقت فہم اسرار معانی — شناسائے مزاجِ نکتہ دانی
حیا پروردۂ نوز نگاہش — ادب اگ گوشۂ طرف کلاہش
نیاید از زبانِ نکتہ پرور
گرامی مدحتِ داغ سخن ور

رہنا ممکن نہیں ہوتا تو اجازت لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور اعلیٰ حضرت بڑی خوشی سے مجھے بیٹھنے کی اجازت دیا کرتے ہیں۔

---

۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء

منی بائی آج ۸ روز ہوئے کلکتہ سے تشریف لے آئی ہیں۔ ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہوئی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں ہے صوم و صلوٰۃ کی یہ پابندی پانچ یا چھ برس سے ان کی گھٹی میں پڑ گئی ہے ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں ان کی اس حالت کو دیکھ کر مرزا صاحب فرما رہے ہیں کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی۔

منی بائی حجاب جب حیدرآباد وارد ہوئیں تو جو چیز سب سے پہلے ان کو پیش کی گئی وہ ایک جا نماز اور تسبیح تھی۔ جس روز سے منی بائی تشریف لائی ہیں، مرزا صاحب کی زبان پر ان کے زہد کا ذکر ہے، آج فرما رہے تھے کہ میرے گھر میں فرشتن آئی ہے۔ آسمان پر شور مچا ہوا ہے، اللہ میاں کے پاس فرشتے فریاد لے کر گئے کہ آدمیوں میں اے خدا تو نے عبادت کی ایسی طاقت کب دی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ داغ کے گھر میں ایک عورت ایسی آئی ہے جو ہم سے بھی سبقت لے گئی ہے مرزا صاحب اس ضمن میں یہ بھی بولے کہ میں نے بی حجاب سے کہدیا ہے کہ نماز کے سوا جب تک تمہارے وظیفے وظائف نہیں چھوٹیں گے اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہیں بن سکتیں اس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں،

بہر حال تم یاد رکھو رفتہ رفتہ تمہارے سب وظیفے چھڑا دوں گا اور تم کو خالی نماز پر اکتفا کرنا ہوگا۔

٢٣ر جنوری ١٩٠٢ء

ڈاکٹر احمد علی[1] حیدرآباد میں ایک فوجی ڈاکٹر ہیں آج شام کو ہم بہت سے لوگ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے اتنے میں ڈاکٹر صاحب موصوف تشریف لائے، مرزا صاحب ان سے بولے کہ حضرت ہمارے یہاں فرشتن آئی ہوئی ہیں، مرزا صاحب کی ایک ماما کسی کام سے اسی وقت باہر آئی، ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ کیا یہی فرشتن ہیں، مرزا صاحب ہنس کر بولے کہ نہیں یہ تو چڑیل ہے اس کے بعد منی بائی حجاب کا ذکر ہونے لگا، مرزا صاحب نے بتایا کہ وہ دو تین برس کامل اجمیر رہی ہیں، وہاں چلہ کشی بھی کی تھی، کوئی مراد دل ہی میں ہوگی، ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ نماز نہ روزہ کیسا، کسبی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ ہر وقت نماز ہے اور ہر وقت تسبیح مصلے پر بیٹھی ہوئی ہیں، کون سی نماز ایسی ہے

---

[1] ڈاکٹر احمد علی حیدرآباد کے قدیم باشندے تھے بڑے علم دوست اور باذاق بزرگ تھے، عقیدتاً شیعہ تھے اور بڑے وسیع القلب داغ سے بڑا خلوص تھا، محلہ کوٹلہ عالی جاہ میں رہتے تھے، داغ کے بعد وفات پائی، صاحب اولاد تھے، ڈاکٹر صاحب خود کو مشائخ گھرانے سے ظاہر کرتے تھے، پیری مریدی کا بھی شوق تھا اور خود کو صوفی صافی اور پیر طریقت ظاہر کرتے تھے۔

جو نہ پڑھی جاتی ہو ؎

ایک بے تکلف نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا حضرت آپ ان سے شادی کریں گے انہوں نے جواب دیا کہ بھائی مجھے نہیں معلوم ۲۲ برس کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا ہے میں تو راضی ہوں مگر وہ ابھی راضی نہیں ہیں، بہرحال ؎

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں،
اور کھل جائیں گے دو ایک ملاقاتوں میں

اسی صحبت میں ایک بے تکلف نے کہا کہ حضرت آپ کی عمر ۷۲ برس کی ہو چکی اب آپ کس برتے پر عقد کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے نکاح سے کیا فائدہ، مرزا صاحب نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

جناب داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک
کہ وہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

مرزا صاحب نے فرمایا کہ مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و ریشہ میں سمائے ہوئے ہیں، ایک بی منی بائی حجاب کا عشق دوسرا خواجہ معین الدین چشتی کا۔

۲۵ جنوری ۱۹۰۲ء

جب سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب اپنے مردانے مکان میں کم بیٹھتے ہیں، دو تین گھنٹے کے سوا سارا وقت حجاب کے پاس

گزرتا ہے، مرزا صاحب کی یہ ادا ان کے احباب کو سخت ناگوار ہے، اسی واسطے ان کے مخلص دوستوں کی آمد و رفت کم ہوگئی ہے، آج بعد مغرب مرزا صاحب نے اپنے ایک دوست نواب سید حسین علی خاں کو جب کہ وہ دو روز سے تشریف نہیں لائے تھے مجھ سے یہ خط لکھوایا :۔

نواب صاحب بہادر، کہتے ہیں کہ کل پتنگوں کے پیچ میں بغیر نواب صاحب کی تشریف آوری کے[1] کچھ نہیں ہو سکتا، مجکو خبر نہیں تھی کہ پیچ وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑیں گے، مردِ خدا یہ کیا بات ہے، آپ نے یکلخت ملاقات کم کرکے کیوں

---

[1] اس اجمال کی تفصیل نواب میر حسن علی خاں کے پوتے جناب یٰسین علی خاں نے نگار کے داغ نمبر میں خوب فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ بی حجاب اور داغ کو پتنگ بازی سے دلچسپی تھی، مرزا خورشید عالم سے وہ بے پردہ ہو چکی تھیں، حجاب کے ہی ایما سے پتنگوں کے پیچ مقرر ہوئے تھے، مرزا خورشید عالم نے داغ سے کہدیا کہ نواب صاحب مجھ سے بے پردگی اور ان سے پردہ کرنے پر رنجیدہ ہیں اور ان کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا داغ نے اسی شب بہ تذکرۂ صدر رقعہ نواب صاحب کو لکھا۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ مجھے داغ سے بے حد محبت تھی، جب یہ رقعہ مجھے ملا تو میں صبح کے انتظار میں بے چین رہا صبح نماز کے بعد ہی وہاں پہونچا، ملازم نے کہا داغ نیچے ہیں اور خود پکوان کی نگرانی کر رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ آج انہیں پکانے کی خوب سوجھی میں اوپر بیٹھا رہا تھوڑی دیر میں ملازم آیا اور کہنے لگا کہ سرکار آپ کو نیچے بلاتے ہیں، مجھے معلوم تھا کہ وہ زنانہ حصۂ مکان ہے اس لئے میں نے ملازم سے کہا، مجھے نہیں (باقی صفحہ ایر)

ترک کردی میں نے کوئی بات بغیر آپ کے مشورے کے نہیں کی
مصلحت وقت نہیں چھوڑی جاتی، آپ کو حسب معمول روز آنا چاہیے
ماحضر یہیں تناول فرمانا چاہیے اور اگر یہاں کھانا گوارا نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۷۴) کسی اور کو بلایا ہوگا، وہ چلا گیا اور پھر بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا، سرکار کہتے ہیں کہ نواب صاحب کو یہاں بلا لو، میں نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ داغ ڈیوڑھی کے دروازے پر میرے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں، جیسے ہی مجھ کو دیکھا فرمایا زود رنج نواب آگئے اور گلے سے لپٹا لیا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے چلے، نواب صاحب کہتے تھے کہ جیسے ہی میں نے صحن خانہ میں قدم رکھا تو ایک قہقہہ کی آواز سنی اور بی حجاب میرے سامنے تھیں اور داغ مسکرا رہے تھے، میں نے سلام کیا حجاب نے اس کا جواب نہایت خندہ پیشانی سے دیا اور خاموش رہیں، داغ بہت خوش تھے کہنے لگے آج تمہارے لئے بریانی پک رہی ہے، نسخہ حیدرآبادی ہے، اندر کے دالان میں دو تخت پڑے ہوئے تھے اور ان پر دو بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے، ہم اور داغ تخت پر بیٹھ گئے، حجاب بھی کچھ دور کرسی پر آکر بیٹھ گئیں۔ اور خاموش رہیں، داغ نے امیر (پردردہ) سے کہا، حقہ لا، دو حقہ آگئے تھوڑی دیر تک سکوت رہا اس کے بعد داغ نے فرمایا کہ آج پتنگوں کے پیچ ہیں، آپ ہماری طرف ہونگے، دیکھیں مرزا خورشید کیسے پیچ کاٹتے ہیں، یہ فقرہ سن کر حجاب بول اٹھیں ہاں نواب صاحب ہماری طرف ہونگے اور داغ سے کہا کہ سامان تو نواب صاحب کو دکھا لیں اٹھ کر برابر کے کمرے میں گئیں وہاں سے دو چار پتنگ اور مانجھے کی چرخی لئے ہوئے آئیں اور نواب کے سامنے رکھ دیا، نواب صاحب (باقی صفحہ ۱۷۶ پر)

تو بہتر نہ کھائیے مجکو غم بھی نہ کھلائیے، آئیے آئیے تشریف لائیے۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۵) نے پتنگ اور مانجھا دیکھا اور کہا بہت اچھا سامان ہے آج صاحب عالم بہادر کی خیر نہیں، اس کے بعد حجاب کھلتی گئیں اور کہا کہ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا روزانہ آپ کا نام سنتی تھی، آج ملاقات ہوئی، داغ مسکراتے جاتے تھے اور حجاب و نواب صاحب کی گفتگو سنتے جاتے تھے، داغ نے کہا نواب صاحب صبح کو چار پیتے ہیں اگر دیر ہو گئی تو خفا ہو جائیں گے حجاب نے زور سے قہقہہ لگایا اور کسی سے کہا کہ جلد چار لاؤ ورنہ نواب روٹھ جائیں گے، تھوڑی دیر میں اسی تخت پر دسترخوان بچھا، خورشید عالم بھی بلائے گئے ان کے آتے ہی داغ نے بلند آواز سے کہا کہ صاحب عالم بہادر (یہ خورشید عالم کا عرف تھا) نواب صاحب ہماری طرف ہونگے، ان کا کہنا ہے کہ آج دیکھیں تو آپ پیچ کیسے کاٹتے ہیں صاحب عالم نے کہا اب دیر ہی کیا ہے خود ہی فیصلہ ہو جائیگا.............بہت سی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد دوپہر کے کھانے سے قبل تک پتنگ بازی ہوتی رہی، جب دھوپ تیز ہو چلی تو یہ شغل بند ہوا، دوپہر کا کھانا کھا کر نواب صاحب اپنے گھر واپس ہوئے اور اس روز سے حسب سابق داغ کے پاس وہ آنے جانے لگے۔"

۲۷/جنوری ۱۹۰۳ء

بی حجاب تشریف لائیں تو پردے کا بڑا اہتمام تھا، دو ایک روز مرزا صاحب سے بھی تکلف رہا اور کسی حد تک پردے کا اہتمام رہا۔ اسکے بعد یہ حجاب ٹوٹ گیا اور وہ مرزا صاحب کے سامنے آگئیں۔ حجاب کا قیام مکان کی نیچے والی منزل میں رہتا ہے چنانچہ مرزا صاحب اپنا زیادہ وقت اب نیچے ہی گزارتے ہیں، دونوں وقت کھانا بھی اب نئے مہمان کے ساتھ ہی کھاتے ہیں، مرزا صاحب کے متعدد شاگردوں اور احباب کا بیشتر وقت ان کی خدمت ہی میں گزرتا تھا، جب سے مرزا صاحب کے معمولات میں فرق ہوگیا ہے، بہت سے شاگردوں اور احباب نے آنا جانا کم کر دیا ہے۔ حجاب ذرا گرم مزاج ہیں اور ہمہ وقت اس کوشش میں رہا کرتی ہیں کہ مرزا صاحب ان کے سامنے رہیں، اپنے اور مرزا صاحب کے معاملات میں کسی کی مداخلت انہیں مطلق پسند نہیں ہے، مرزا صاحب کے اعزا میں اب تک صرف مرزا خورشید عالم سے وہ بے پردہ ہوئی ہیں۔ بی حجاب کے ساتھ انکا بھائی خدا بخش[۱] بھی کلکتے سے آیا ہے اور وہ اس وقت مرزا صاحب کے گھر میں کافی دخیل ہے۔

---

[۱] خدا بخش منی بائی حجاب کا چھوٹا بھائی تھا، حجاب جب کلکتہ واپس ہوگئیں تو وہ یہیں رہ گیا وہ داغ کی نسبت سے بابو خدا بخش کہلایا رنڈیوں کو گانا سکھانا اس کا روزگار تھا، بڑا اچھا سازندہ تھا، داغ کی وفات کے بعد یہی ذریعہ معاش رہا، مدت تک حیدرآباد رہا، بعض امرا کو بھی گانا سکھاتا تھا

۲۹ جوری سنہ ۱۹۰۲ء

صبح کے نو بجے تھے، مرزا صاحب کے پاس راقم (افتخار عالم صاحب) اور سید علی احسن صاحب مارہروی بیٹھے ہوئے تھے، غزلوں پر اصلاح ہو رہی تھی، مولوی شبلی نعمانی اور ظفر علی خاں مرزا صاحب سے ملاقات کرنے آئے، مولوی ظفر علی خاں نے اثنائے گفتگو میں ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایسے بے ہمتا اور بے بدل شاعر کی صحبت میں رہ کر فیوض حاصل کرتے ہیں مولوی شبلی نے اس پر فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے شاعر مثلاً لبید وغیرہ کے ساتھ ایک ایک شخص رہا کرتا تھا، جس کو عرب والے مبالغہ کر کے "راویہ" کہا کرتے تھے اسی طرح فصیح الملک کے یہ دونوں راویہ ہیں — مرزا صاحب بولے آپ انہیں راویہ کہتے ہیں، میں تو انہیں کراماً کاتبین میں شمار کرتا ہوں۔ یہ دو تو میری نظروں کے سامنے رہتے ہیں اور وہ نظروں سے غائب میرے کندھوں پر —،

۲۰ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء

بی حجاب اب مرزا صاحب کے کئی احباب اور تلامذہ سے بے پردہ ہو چکی ہیں اور وہ حجاب جو درمیان میں حائل تھا دور

ہو گیا ہے لیکن یہ عزت ابھی مخصوص افراد ہی کو ملی ہے، بی حجاب کا سن اس وقت ۵۴ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے لیکن خد و خال ایسے ہیں کہ ان کی عمر اس سے بھی کم معلوم ہوتی ہے، رنگ سرخ و سفید ہے، آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی ہیں، ناک اونچی، بالوں کا کچھ حصہ سفید ہو چلا ہے جو ان کی زیادتی عمر پر غمازی کرتا ہے سفید بالوں پر خضاب لگاتی ہیں، میانہ قد اور تندرست جسم کی حامل ہیں، اونچی کشادہ پیشانی ہے، مانگ پھٹی پھٹی سیدھی نکالتی ہیں، ٹھوڑی کے نیچے ایک خوش نما تل ہے، گال قدرے پچکے ہوئے ہیں، قہقہہ لگانے کی بہت عادت ہے، تنگ پاجامہ اطلس کا بہت پہنتی ہیں جس پر مغزی ٹنکی ہوتی ہے، ڈوپٹہ سفید باریک چنا ہوا اور کرتا ململ کا جسم پر چھنسا چھنسا پہنتی ہیں زیوروں میں ہاتھ کی پتلی پتلی انگلیوں میں انگوٹھیاں، گلے میں گلوبند، کلائیوں میں سونے کی نقش دار چوڑیاں، کانوں میں آویزے ہر وقت پہنے رہتی ہیں، پاؤں البتہ زیور سے خالی رہتے ہیں، جوتا عام طور سے دہلی کا کامدار پہنتی ہیں، پان بے انتہا کھاتی ہیں، حقہ پینے کا بھی شوق ہے، غرض کہ بی حجاب اب بھی حسنِ رفتہ کی ایک دیدہ زیب اور خوش منظر یادگار ہیں، وہ اس ہیولے سے جسکی تصویر مرزا صاحب نے اپنی مثنوی فریادِ داغ میں کھینچی ہے گو کچھ مختلف ہو چکی ہیں تاہم ان کے موجودہ خد و خال کی اب بھی مرزا صاحب کے بیان کئے ہوئے سراپا سے بڑی حد تک مطابقت ہوتی ہے، مثنوی میں مرزا صاحب نے

حجاب کی تصویر یوں کھینچی ہے :۔

سچ دھج آفت غضب تراش خراش
کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش

نشۂ حسن کی ترنگ غضب
نوجوانی کی ہے امنگ غضب

حسن کی آن بان ہائے غضب
بے نیازی کی شان ہائے غضب

جس طرف اٹھ گئی وہ شوخ نگاہ
شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ

رخ سے ظاہر تھا نور کا عالم
اور اس پر غرور کا عالم

گات بانکی بدن سڈول تمام
فتنہ قد، فتنہ چشم و فتنہ خرام

اف رے عہد شباب کی مستی
بے پیئے ہے شراب کی مستی

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
ادھر آنا ادھر نکل جانا

شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی
لن ترانی جواب میں کیسی

کجی کجی بھوؤں کی وہ تحریر
کیوں نہ دل اس لکیر پہ ہو فقیر

ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور
شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور

ان اشعار کے مقابلے میں جب ہم منی بائی صاحبہ کے موجودہ خد و خال دیکھتے ہیں تو مرزا صاحب کی تصویر کشی کی داد دینا پڑتی ہے، گو بڑھاپے کی سرحد میں بی حجاب قدم رکھ چکی ہیں، لیکن انکی بات بات میں وہی ترنگ اور وہی ولولے نظر آتے ہیں جنکی تصویر ذرا سے شاعرانہ مبالغے کے ساتھ مرزا صاحب نے فریاد داغ میں کھینچی ہے۔

یکم فروری ۱۹۰۲ء

آج جب میں پہونچا تو مرزا صاحب اندر تھے، میں باہر بیٹھ گیا، نہ معلوم کس نے اطلاع کر دی، مجھے مرزا صاحب نے اندر ہی بلالیا، اس وقت وہاں کوئی اور نہ تھا، مرزا صاحب اور صرف حجاب موجود تھیں، مرزا صاحب ایک پلنگ پر دراز تھے، حقہ منہ سے لگا ہوا تھا، بی حجاب تخت پر فروکش تھیں اور شعر و شاعری ہو رہی تھی، بی حجاب غزل سنا رہی تھیں اور مرزا صاحب بڑے انہماک سے سن رہے تھے، میں سمجھا کہ شاید کوئی غزل حجاب صاحبہ نے کہی ہے اس پر اصلاح ہو رہی ہے لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ بی حجاب اپنی غزل سنا رہی ہیں، میں جس وقت پہنچا ہوں تو وہ مطلع اور ایک شعر پڑھ چکی تھیں، مرزا صاحب بولے کہ بھئی ہمارا ایک ہونہار و ذہین شاگرد آگیا، اسے بھی تمہارا کلام سننے کا ضرور اشتیاق ہوگا پھر سے غزل شروع کرو، حجاب مسکرائیں اور غزل ابتدا سے پڑھنے لگیں، غزل یہ تھی:۔

غزل

حالِ حجاب قابلِ شرح و بیاں نہیں
آنسو نہ ٹپکیں منہ کے یہ وہ داستاں نہیں

دل میں جگر میں سینہ میں پہلو میں آنکھ میں
اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں

پوچھو نہ حالِ زار مرا تم سے کیا کہوں
گم کردہ راہِ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں

دیتے ہیں چھیڑ چھیڑ کے کیوں مجھ کو گالیاں
سمجھے ہوئے ہیں وہ کہ منہ میں زباں نہیں

مرزا صاحب نے وو ایک جگہ داد دی، غزل سے زیادہ لطف بی حجاب کے پڑھنے کے انداز میں تھا، باریک و شیریں آواز، جس وقت وہ مصرع اٹھاتی تھیں، ان کی آواز دل و جگر کے پار ہو جاتی تھی گانے کے فن سے چونکہ آگاہ ہیں، خاصی پڑھی لکھی بھی ہیں، لہذا شعر کا ہر بول جہاں ستانی باقاعدگی کا حامل تھا۔ ہیں ان کی آواز نغمہ و موسیقی کے تمام زیر و بم کے لوازمات کی حامل تھی، غزل جب ختم ہوئی تو دیر تک فضا میں بی حجاب کی پر کیف و شیریں آواز تیرتی رہی۔

۲ر فروری ۱۹۰۳ء

کلکتہ میں کوئی قاضی عبدالحمید صاحب[1] رجسٹرار محمڈن میریجز ہیں ان کو مرزا صاحب نے آج ایک خط لکھوایا۔

---

[1] قاضی عبدالحمید صاحب کلکتے کے رہنے والے تھے، سید محمد عثمان کاملی کے بیٹے اور حافظ مولوی جمال الدین کے نواسے تھے، کلکتے ہی میں پیدا ہوئے اور شہر کے قاضی تھے اسی رعایت سے انھوں نے خود کو رجسٹرار محمڈن میریجیز Mohammadan Marriages کہا ہے اچھے شاعر تھے شروع میں حکیم محمد سجاد موہانی کے شاگرد ہوئے میر لساخ کو کلام دکھایا، چیف انجینئر ایسٹ انڈین ریلوے کے دفتر میں ڈرافٹسمین تھے، ایک مختصر سا مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے

قاضی صاحب مصدرِ عنایت و کرم سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون کے بعد دعا نگار ہوں کہ آپ کا محبت نامہ پہونچا جس میں ایک دعائیہ شعر بھی تھا، بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہنچیں، میرا مکان بھی آسمان ہے کہ بی فرشتن کا نزول ہے، میں رندِ خراباتی اور وہ زاہد مناجاتی، دیکھئے کیا ہو، ابھی مجھے اس پردے میں نہیں معلوم کہ وہی ہیں یا کوئی اور ـــــ،

مرزا صاحب آج بڑی دیر تک اپنے خاص خاص احباب کا ذکر کرتے رہے، مرزا صاحب امیر مینائی اور سید جلال کا ذکر ہمیشہ بڑی دلسوزی سے فرمایا کرتے ہیں، سید جلال کے متعلق مرزا صاحب کا خیال ہے کہ وہ بڑے غصہ ور اور پر جلال تھے، چنانچہ اسی بنا پر اکثر ان سے اور مرزا صاحب سے مذاق مذاق میں چوٹیں ہو جایا کرتی تھیں، مرزا صاحب نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ ایک مشاعرے میں میں نے یہ مطلع پڑھا اور جلال سے داد کا طالب ہوا۔ مطلع تھا ؎

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

جلال مسکرائے اور فرمایا کہ پہلا مصرع نہیں لگا، جب ان کے پڑھنے کی باری آئی تو انہوں نے میرے اس مطلع کے مصرع اولیٰ کو بدل کر یوں شعر بنایا ؎

بزمِ داغ

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

۳ر فروری ۱۹۰۲ء

آج ظفر علی خاں[۱] صاحب جنہوں نے لارڈ کرزن کی یادگارِ زمانہ کتاب PERSIA کا اردو ترجمہ کیا ہے مع اپنی کتاب کے حاضر ہوئے اور مرزا صاحب سے مستدعی ہوئے کہ اس پر تقریظ لکھدی جائے، مرزا صاحب نے اول تو ٹالنا چاہا لیکن جب ظفر علی خاں نے بہت اصرار کیا تو مجھے حکم ہوا کہ لکھو، مرزا صاحب بولتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا

۱؎ مولانا ظفر علی خاں ملک کے مشہور لوگوں میں سے گزرے ہیں، بڑے صاحبِ کمال اور فن کار شاعر و ادیب تھے، شروع میں حیدر آباد میں ایک ترجمان کی حیثیت سے ملازم رہے اس کے بعد اپنے وطن پنجاب چلے آئے، تحریک آزادی کے زبردست علمبردار تھے، کئی اخباروں کے اڈیٹر رہے، اخبار زمیندار کے مالک تھے، یہ اخبار مخصوص عقائد و رجحانات کا حامل تھا، اس اخبار کے مقالات میں آزادہ گوئی اور اصابت رائے کی جو روح مولانا ظفر علی خاں نے پیدا کردی تھی وہ دوسرے بہت کم اخباروں میں پائی جاتی تھی، متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف اور مترجم تھے، شاعری میں بڑا اچھا ملکہ تھا، آپ کی نظمیں بڑی جوشیلی اور سبق آموز ہوا کرتی تھیں۔

تھا، دو صفحات کی نہایت اعلیٰ تقریظ[1] مرزا صاحب نے بلا تکلف لکھوا دی اور دستخط کر کے وہ کاغذ ظفر علی خاں صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے یہاں سے آدمی مشاعرے کا دعوت نامہ لے کر پہنچا، مرزا صاحب نے مشاعرے میں آنے کا وعدہ کیا، مرزا صاحب چند مشاعروں کے علاوہ شہر کے دوسرے مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد، خانساماں محمد ابراہیم خاں اور راجہ رائے رایاں[2] کے مشاعروں میں انہیں لازمی شریک ہونا پڑتا ہے، مشاعرہ رات کے نو بجے سے شروع ہونے والا تھا۔ دو گھنٹے پہلے مرزا صاحب کے لئے جوڑی آگئی، لیکن مرزا صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے اور آئی ہوئی جوڑی پر حاضر باش شاگرد سوار ہوئے، مرزا صاحب کی گاڑی جب مقام مشاعرہ کے قریب پہنچی تو راجہ کشن پرشاد مدار المہام بہادر اپنی نشست سے اٹھ کر پچاس ساٹھ قدم آگے بڑھے، اس دوران میں مرزا صاحب بھی سواری سے اتر چکے تھے۔ مدار المہام بہادر نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا، اور اپنے ساتھ محفل مشاعرہ میں لے جا کر ایک مخصوص نشست

---

[1] یہ تقریظ مرزا داغ کے مجموعۂ خطوط موسومہ "انشائے داغ" مولفہ احسن مارہروی اور "زبان داغ" مولفہ سید رفیق مارہروی میں بہ تمام و کمال درج ہے۔

[2] راجہ رائے رایاں امانت وقت بہادر قدیم امیر اور ایک خاندانی بزرگ تھے ان کے گھرانے میں وزارت رہ چکی تھی، بڑی جاگیرات تھیں، اردو ادب و شعر سے بڑا شغف تھا۔ داغ کے بڑے قدردان اور مداح تھے۔

پر مرزا صاحب کو بٹھا دیا، مرزا صاحب کے پہونچتے ہی مشاعرہ شروع ہوگیا دس پندرہ شاعروں کی غزلوں کے بعد ایک ہزل گو مسمی عابد مرزا المتخلص بیگم جنکو ریختہ گوئی میں بھی دخل ہے صدر میں آئے اور ہزل شروع کی "زبان سے" "یہاں سے" کے قافیہ و ردیف میں ایک قطعہ[1] پڑھا قطعہ میں دہلی اور دہلی کی زبان کی مذمت تھی، بیگم کی اس حرکت سے مرزا صاحب

---

[1] عابد مرزا پٹنہ سے حیدرآباد پہونچے تھے۔ محبوب علی خاں نظام دکن نے قدر افزائی کی اور انعام واکرام سے کافی نوازا ——— لکھنؤ اور دلی کے شعراء میں جو قدیم سے آویزش چلی آتی ہے اس کے ماتحت ہمیشہ شعراء میں نوک جھونک رہا کرتی تھی، ایک دفعہ ابراہیم خاں خانساماں کے مشاعرے میں مرزا خورشید عالم نے لکھنؤ کی مذمت میں جو اشعار پڑھے تھے وہ معاملہ تو اس وقت دبا دیا گیا لیکن اس مشاعرے میں لکھنوی شعراء نے بیگم سے ایک قطعہ پڑھوایا جس کا اوپر اظہار ہوا ہے، قطعہ بہت طویل ہے، چند شعر سن لیجئے۔

سناتے ہو جو مجھے باتیں ہزاروں — کہوں میں بھی جو کچھ اپنی زباں سے
تو اس دم کر کری ہو جائے گی بس — سبھوں کے سامنے میرے بیاں سے
جسے کہتے ہیں اردو وہ ہے لشکر — سنی باتیں جو لشکر کی زباں سے
اسی کا نام اردو ہو گیا ہے — کوئی منکر نہیں میرے بیاں سے
ہوئی جب چھاؤنی دلی میں آ کے — وہاں لوگ آ گئے سارے جہاں سے
ہوا ہر قوم کے لوگوں کا مجمع — کوئی کابل کوئی ماژندراں سے

بہت منغض ہوئے اور مہاراجہ صاحب سے اجازت لے کر مشاعرے سے چلے آئے انہیں کے ہمراہ اور بھی بعض لوگ مشاعرے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

٭٭٭٭٭٭٭٭

(بقیہ صفحہ ۱۸۶)

عرب تھا کوئی اور کوئی عجم تھا ۔۔۔ کوئی شیراز کوئی شیرواں سے
جو کیں آپس میں ان لوگوں نے باتیں ۔۔۔ تو اردو کی زباں نکلی یہاں سے
زباں یا ست نجا بھونا ہوا تھا ۔۔۔ کہ گرما گرم آیا ہو دکاں سے
نمک مرچیں ملی ہیں لکھنؤ سے ۔۔۔ کہ اب تک رال بہتی ہے زباں سے
وہ اردو تھی کہ اک لکڑی کا چیلا ۔۔۔ نہ نکلے جس کے کانٹے باغباں سے
خدا دا لکھنؤ والوں نے اس کو ۔۔۔ تمہیں کیوں فخر تم لائیں کہاں سے
مری جاں لکھنؤ والوں کے آگے ۔۔۔ بہت مشکل ہے کچھ کہنا زباں سے
نہ کہنا تم کہ میں بھی ہوں زباں داں ۔۔۔ ذرا للّو کو روکو اس بیاں سے
میں اپنے وقت کی زیب النسا ہوں ۔۔۔ جواب اپنا کوئی لائے کہاں سے
یہ کہنا ہے بہت بے جا دوگانا ۔۔۔ کہ اچھی ہوں میں ہی سارے جہاں سے
نہیں کرتا زمانے کا ہے دستور ۔۔۔ ثنا اپنی کوئی اپنی زباں سے
ہے فضلنا بڑی روٹی میں آیا ۔۔۔ ذرا پوچھو میاں حافظ میاں سے
کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک ۔۔۔ سنا میں نے یہ آتوں کی زباں سے
زباں کے خلد کی ہے حور عورت ۔۔۔ اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے

۶ر فروری ۱۹۰۲ء

آج کی صحبت میں بی حجاب کا ذکر خوب گرم رہا، مرزا صاحب کے چند بے تکلف دوست جمع تھے جو مرزا صاحب کے تمام مشوروں میں شریک رہا

(بقیہ صفحہ ۱۸۱)

زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر ۔۔۔ یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے
زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت ۔۔۔ انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا ۔۔۔ لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے
نگوڑی سوت جل ککڑی کے ہاتھوں ۔۔۔ بتنگ آئی بہت میں اب یہاں سے
یہ بیکاری بنی ہے سوت میری ۔۔۔ نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے
وطن چھوڑا اسی شغل کے پیچھے ۔۔۔ دکن میں آئی میں ہندوستاں سے
بچھڑایا مجھکو پیاروں سے اسی نے ۔۔۔ چھپا کے میں چلی آئی وہاں سے
موئی کو لاگ مجھ سے ہوگئی ہے ۔۔۔ یہاں بھی آن لپٹی میری بلا سے
سند اس نے مجھے دی مفلسی کی ۔۔۔ نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے
غرض ہونا جو ہے ہو جائے مجھ پر ۔۔۔ میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے
مری اب پرورش فرمائیں آصف ۔۔۔ کنیزی میں رہوں میں دل سے جاں سے
تو میری مفلسی اس طرح بھاگے ۔۔۔ کہ جیسے تیر چھٹتا ہے کماں سے
جو مجھکو عرض کرنا تھا کیا بس ۔۔۔ دعا بیگم یہ ہے دل سے زباں سے

بجے چاروں طرف آصف کا ڈنکا
خراج اس کو ملے سارے جہاں سے

کرتے ہیں ایک صاحب نے ازراہِ تمسخر دریافت کیا کہ کیوں صاحب آپ کا سن یہ ہے کہ منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے، ڈاڑھی اور سر کے بال خضاب و مہندی سے سیاہ و سرخ کئے جاتے ہیں، آخر کس برتے پر آپ حجاب سے نکاح کرنے پر آئی ہیں، مرزا صاحب نے فرمایا کہ نکاح کرکے عام اصطلاح میں حجاب کو میں اپنی بیوی نہیں بناؤں گا، مجھے اپنی کبرسنی کا احساس ہے، منہ میں بجائے قدرتی دانتوں کے مجھے بتیسی محسوس ہوتی ہے، وسمہ و مہندی بھی ہفتے میں دو دفعہ لگتی ہے، میری مسہری بھی ایک نوعروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے، رنگین جالی کے پردے جن پر گوٹا اور بیٹھا ٹنکا ہوا ہے، انگوری بیل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے تو پھر جب یہ سب باتیں روا ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ منی بائی حجاب میرے لئے جائز نہ کر دی جائیں، اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بیوی، بیوی ہوتی ہے دوسری بیوی رفیق ہوتی ہے اور تیسری بیوی درحقیقت جان کا جنجال، مرزا صاحب کی اس گفتگو نے سب کو ساکت کر دیا۔

۱۴ر فروری ۱۹۰۲ء

آج صبح میں پہنچا تو مرزا صاحب کسی فکر میں مستغرق تھے، میں خاموش بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد مرزا صاحب بولے، دیکھو سید میرا یہ شعر منی بائی کی کتنی صحیح تصویر ہے، یہ کہہ کر شعر سنایا ؎

شوخی، فریب، سحر، فسوں، لاگ شعبدہ
کتنے کرشمے دیکھے تری اک نگاہ میں

میں شعر سن کر خاموش ہو گیا، کیا جواب دیتا۔

۲۱ر فروری ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب درحقیقت بڑے شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں، بڑھاپے کا عالم بھی جوانی کا عالم معلوم ہوتا ہے، وہی مذاق، وہی دل لگی، چھوٹی چھوٹی تین چار لڑکیوں کو پرورش کیا ہے، صاحب جان اور امیری بڑی چنچل لڑکیاں ہیں، جب ان کے پاس کوئی نہیں ہوتا ہے تو ان کو بلاتے ہیں، ان سے مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور وہ مرزا صاحب کا دل بہلایا کرتی ہیں، مرزا صاحب ان سے خوب کھل کر ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ کبھی کہا کرتے ہیں کہ امیری میرا دل چاہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ شادی کر لوں وہ جواب دیتی ہے کہ سرکار آپ کے سر کے بال سفید، منہ میں دانت ندارد، میں آپ سے شادی کر کے کیا کروں گی آج شام کو جب میں پہنچا تو مرزا صاحب انہیں رنگ رلیوں میں مصروف تھے، میرے پہنچتے ہی صاحب جان اور امیری ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی گھر میں بھاگ گئیں، مرزا صاحب نے مجھے دیکھ کر برجستہ یہ شعر پڑھا:

دن گزارے ہے سُکھ کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

۲۴ر فروری ۱۹۰۳ء

آج کی نشست میں مردان علی صاحب نے فرمایا کہ میں کل تھیٹر[1] دیکھنے گیا تھا، ایک موقع پر ایک ایکٹر نے آپ کی غزل جس کی زمین ہے "جانے کے لئے، زمانے کے لئے" گائی۔ گاتے گاتے اس کا یہ عالم ہوا کہ وہ کپڑے پھاڑنے لگا اور گاتا بھی رہا۔ اس نے اپنے کپڑے اس شعر کو پڑھنے کے بعد پھاڑنا شروع کئے تھے ؎

غنچۂ دل کے عوض تازہ ہوئے داغ جنوں
کیا بہار آئی تھی دیوانہ بنانے کے لئے

میر صاحب یہ واقعہ بیان کر رہے تھے اور حاضرین ہمہ تن گوش تھے۔

---

[1] صفدر مرزاپوری نے اپنی کتاب "حسن خیال" میں جو لطائف ادبیہ کا مجموعہ ہے تھیٹر سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ درج کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حیدرآباد دکن میں ایک تھیٹر آیا، اس میں کوئی مشہور کھیل تھا۔ لوگوں کے اصرار پر حضرت داغ بھی تھیٹر دیکھنے گئے، داغ کی شہرت عام تھی ان کو تھیٹر میں بڑی نمایاں جگہ پر بٹھایا۔ ایک مسخرے ایکٹر نے داغ کی غزل شروع کی، جب مقطع پر پہنچا تو مرزا داغ کی طرف اشارہ کر کے مقطع کا آخری مصرع یوں پڑھا ع

"جسے داغ کہتے ہیں اے بتو اسی روسیاہ کا نام ہے"

مرزا داغ سیاہ فام تھے، مسخرے ایکٹر کی اس حرکت سے لطف آ گیا داغ کے بے تکلف دوستوں نے "once more" کا شور مچا دیا۔

میر صاحب جب واقعہ بیان کر چکے تو مرزا صاحب نے ہنس کر میر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے یہ بھی غور فرمایا کہ اس ایکٹر نے اپنا پاجامہ بھی پھاڑا اٹھایا نہیں، اس فقرے پر سب ہنسنے لگے۔

مرزا صاحب افضل گنج[1] کے جس مکان میں رہتے ہیں، وہ بہت تنگ مکان ہے، وضع قطع کے اعتبار سے بھی اس کی عمارت خوب نہیں ہے آج محمد مستجاب اللہ خاں بولے کہ آپ کا اتنا اقتدار، اتنی تنخواہ، اتنی عزت اور اتنے تنگ مکان میں رہتے ہیں، مرزا صاحب بولے بھائی تم کو شاید معلوم نہیں سقراط جس مکان میں رہتا تھا وہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں دس پانچ آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی، جس طرح آپ نے

---

[1] داغ افضل گنج کے جس مکان میں رہتے تھے وہ اس زمانے میں لے لیا گیا تھا جب کہ مرزا داغ بے روزگار تھے اور بطور ایک امیدوار کے زندگی گزار رہے مکان واقعی بہت تنگ تھا، لیکن جب ریاست سے وابستہ ہوگئے تو جہاں شان و شوکت میں اضافہ ہوا وہیں ایسے احباب کی بھی کثرت ہوگئی جن کے شایان شان یہ مکان ہرگز نہیں تھا، مرزا صاحب نے مکان کی تبدیلی اور دوسرے اچھے مکان کے لئے ریاست میں درخواست بھی دے رکھی تھی، لیکن برسوں گزر گئے اور وہ درخواست حکم سے محروم رہی، کچھ عرصے کے بعد ایک کوٹھی کرایہ پر مل گئی جو ترپ بازار میں واقع تھی، مرزا صاحب کی بقیہ زندگی اسی عالی شان کوٹھی میں گزری۔

مجھ پر اعتراض کیا اسی طرح لوگوں نے سقراط پر بھی اعتراض کیا تھا۔ سقراط نے لوگوں کو جواب دیا کہ میں نے اپنا یہ مکان مختصر اور تنگ اس لئے رکھا ہے کہ اسے میں اپنے دوستوں سے بھرا ہوا دیکھ کر خوش اور مسرور رہوں اور ذہن میں یہ خیال رہے کہ میرا مکان میرے دوستوں سے بھرا ہوا رہتا ہے، میں نے بھی سقراط کی تقلید میں یہ چھوٹا سا مکان پسند کیا ہے کہ جب آپ لوگ آیا کریں تو مجھے اپنا مکان بھرا ہوا معلوم ہو۔

مرزا صاحب کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار ہے اس ایک ہزار کی رقم سے ساڑھے چھ سو روپیہ ماہوار جو اپنی بیوی کو دیا کرتے تھے وہ اب اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کو گھر کے اخراجات نیز بعض دوسرے ضرورت مند اعزا و اقربا کی مدد و پرورش کے لئے دیتے ہیں، ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار کا اپنا ذاتی اور پرائیوٹ خرچ ہے، مرزا صاحب کے کچھ ایسے قلبی دوست تھے جو وفات پا چکے ہیں، مرزا صاحب حق دوستی اس طرح ادا فرماتے ہیں کہ انکی بیواؤں اور بچوں کو ماہوار تنخواہ دیا کرتے ہیں، مرزا صاحب کے بعض احباب جو انکے بڑے پرانے اور گاڑھے دوست تھے، انکی بیواؤں اور ورثا کو ماہوار دیتے ہیں اسی طرح اور دوسرے لوگوں کی بھی مرزا صاحب حتی المقدور امداد فرماتے ہیں، چند قومی ادارے مثلاً مدرسہ طبیہ دہلی، حمایت اسلام لاہور وغیرہ کو بھی سالانہ امداد دیتے ہیں، بعض مسجد کے موذنوں کی بھی تنخواہیں مقرر ہیں مرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ انسان کو بے شک روپیہ کی ضرورت ہے

لیکن روپیہ سے اتنی محبت نہیں کرنی چاہیے کہ عاقبت خراب ہو، اسی کے ساتھ مفلسی کی بھی وہ برائی کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مفلسی میں انسان کے ایمان کی جانچ ہوتی ہے اگر ذرا بھی انسان بہکا اور اس کی عاقبت خراب ہوئی وہ اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جن ضرورتمند اور قابل مدد افراد کو مجھ سے کچھ پہنچتا ہے ان کو میرے مرنے کے بعد بھی پہنچا کرے، اس کا انتظام مجھے اپنی زندگی ہی میں کرنا ہے اگر زندگی میں نہ ہوسکا تو وصیت کر جاؤں گا، کیا عجب کہ اعلیٰ حضرت مجھ پر رحم فرما کر ان لوگوں کا وظیفہ جاری رکھیں، مجھے انہیں لوگوں کی دعاؤں سے اپنی آمرزش کی امید ہے۔

٭٭٭

۲۷ فروری ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب ہفتے میں دو تین مجرے ضرور سنا کرتے ہیں مگر جب سے حجاب کلکتے سے آئی ہیں ان سے پہلا معاہدہ یہ ہوا ہے کہ کوئی طوائف یہاں نہ آنے پائے، آج شام کو حجاب کے بھائی خدابخش بیٹھے تھے میں بھی موجود تھا، مرزا صاحب مخصوص خدابخش کو چھیڑنے کے لئے اکثر طوائفوں کا ذکر کیا کرتے ہیں خصوصاً اختر جان سورت والی کا ذکر ضرور کرتے ہیں، وہ حجاب کے آنے سے بیشتر کوئی دو برس تک مرزا صاحب کے پاس نوکر بھی رہی تھی، خدابخش کو معلوم تھا کہ میری بہن سے مرزا صاحب کا معاہدہ ہوچکا ہے، لہذا کبھی کبھی خدابخش بھی مرزا صاحب کو چھیڑا کرتے تھے، آج وہ بولے کہ حضرت رحمت اللہ (مرزا صاحب کا گویا) کہہ رہا تھا کہ ایک نئی رنڈی آئی ہوئی

ہے اور حسن و سن کے ساتھ ساتھ گانا بھی اس کا لاجواب ہے، مرزا صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ "کیا تمہاری بہن سے بھی اچھی ہے"، خدا بخش جھینپ کر رہ گئے، مرزا صاحب بولے چلو آج اسے بلاکر ہم گانا سنیں، تم حجاب کی گالیاں سن لینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔۔۔

۵ مارچ ۱۹۰۲ء

آج کی صحبت میں بڑی دیر تک مرزا صاحب کے لاتعداد شاگردوں کے متعلق ذکر ہوتا رہا، ہندوستان میں مرزا صاحب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے شاگرد کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں زیادہ تعداد ایسے شاگردوں کی ہے جو خط و کتابت کے ذریعہ شاگرد ہوئے ہیں اور برس ہا برس سے وہ لوگ استاد سے اصلاح لے رہے ہیں، مرزا صاحب کے شاگردوں میں بہت سے ایسے صاحب استعداد شاگرد بھی موجود ہیں جو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ قدم بوسی حاصل کر چکے ہیں اور تھوڑی تھوڑی مدت ان کے ساتھ مقیم بھی رہے ہیں، مرزا صاحب ہم لوگوں کی اس قسم کی گفتگو سن کر بولے کہ شاگردوں کی بڑی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ ضرور ہے کہ شاگردوں کی بڑی تعداد ایک شاعر کی مقبولیت پر گواہ ہوتی ہے، لیکن وہ شخص کیا کم خوش قسمت ہے جس کے صرف چند شاگرد ہوں مگر سچے اور پرخلوص شاگرد ہوں، استاد کو جائز طور سے ان مخلص اور سعادتمند شاگردوں پر ناز ہو، مجھے خوشی ہے کہ میرے لاتعداد شاگردوں میں ایک

خاصی تعداد ایسے تلامذہ کی ہے جن پر مجھے پورا پورا اطمینان ہے اور جنکی محبت اور جن کے خلوص پر مجھے قطعی بھروسہ ہے، جناب ذوق کے شاگردوں کی تعداد بھی نسبتاً کافی ہے اور اکثر وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے ایسے مخلص اور سعید شاگرد ملے، استاد ذوق کے ساتھ کے اور شعراء میں بھی بعض ایسے خوش قسمت شاعر ملتے ہیں جن کو اپنے بعض شاگردوں کی فرمانبرداری و اطاعت پر بڑا ناز تھا، میرے ساتھیوں میں امیر مینائی کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی ہے اور ان میں بہت سے ان کے نہایت مخلص اور وفادار شاگرد ہیں جن پر امیر مینائی کو ہمیشہ فخر رہا ہے، شاعروں میں ادبی چشمک زنی ہمیشہ رہی لیکن ایک دوسرے کی اس ادبی و شاعرانہ مخالفت کا اثر ان کے شاگردوں کے اخلاق پر خراب کبھی نہیں پڑا کرتا تھا اور وہ اپنے استاد کے احباب کی ایک شاگرد کی حیثیت سے ہی قدر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے نہیں پسند کرتے تھے کہ ان چشمک آرائیوں میں وہ استاد کا ہاتھ بٹائیں۔

لہ اس سلسلہ میں حضرتِ امیر اور مرزا داغ سے متعلق ایک دلچسپ روایت ہے:۔

"ریاض خیر آبادی امیر مینائی کے تلامذہ میں سے تھے، وہ بڑے منکسر المزاج اور صلح کل واقع ہوئے تھے لیکن جہاں تک امیر مینائی سے عقیدت کا تعلق ہے وہ کبھی ان کی برائی برداشت نہیں کر سکتے تھے، ریاض کے کلام کی عام شہرت و مقبولیت سے متاثر ہو کر نواب کلب علی خاں والئ رام پور نے ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا،

(باقی صفحہ ۱۹۷ پر)

۱۰ر مارچ ۱۹۰۲ء

آج بڑی دیر تک ہم لوگوں میں مرزا صاحب کی عاشقانہ زندگی پر گفتگو ہوتی رہی، بہت سے پچھلے واقعات کا ذکر ہوتا رہا، مرزا صاحب کی دو روز سے طبیعت خراب ہے، بعد مغرب ان کو کچھ سکون ہوا تو وہ سو گئے ہم دو چار حاضر باش شاگرد دوسرے حصہ مکان میں دیر تک بیٹھے رہے

(بقیہ صفحہ ۱۹۶) امیر مینائی نے ریاض کو طلب کیا اور وہ رام پور پہنچے، امیر مینائی دوسرے روز انہیں مصاحب منزل لے گئے جہاں حسب دستور دوسرے ارباب کمال حاضر تھے، امیر مینائی نے ریاض کا تعارف اہل بزم سے کرایا اور خود نواب صاحب کے پاس چلے گئے، مرزا داغ اور امیر مینائی سے چونکہ حد درجہ بے تکلفی تھی، لہٰذا انہوں نے ریاض کو چھیڑنے کے لئے کہا کہ "اخاہ آپ ہیں سید ریاض احمد صاحب ریاض، اماں تم کو تو یاروں کا شاگرد ہونا چاہیئے تھا کہاں ان فرنگی محلی مولوی صاحب کے پھندے میں پھنسے ہو" ریاض یہ سنتے ہی چراغ پا ہو گئے اور کہا جناب وہ میرے استاد ہیں انکا ذکر ہی کیا آپ کو اگر دعویٰ ہو تو مجھ ہیچمداں سے ہی دو دو ہاتھ ہو جائیں، بسم اللہ قلم دادات منگایئے، یہاں سب اہل کمال جمع ہیں، سب کے سامنے زمین متعین ہو جائے، ہم اور آپ اسی وقت غزل کہہ لیں، دیکھیں کون بازی لے جاتا ہے، ریاض کے اس جواب پر داغ چپ ہو گئے، پاس ہی مولوی عبدالحق خیرآبادی بیٹھے تھے، ریاض کے ہم وطن اور عزیز بزرگ تھے، ریاض سے کہیں زیادہ آتش خوار اور

(باقی صفحہ ۱۹۸ پر)

دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کی عیش پرستیوں کا ذکر بھی ہوتا رہا۔ میر حسن علی خاں مرزا صاحب کے شاگردوں میں ایک ایسے شخص ہیں جن کو سب سے زیادہ مرزا صاحب کے مزاج میں دخل حاصل ہے، علاوہ شاگردی کے ان کو ایک دوست اور سچے محب کا درجہ حاصل ہے وہ مرزا صاحب کے ڈھکے چھپے واقعات تک سے واقف و آگاہ رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر معاملات میں ان کے مشورے بھی شامل حال رہتے

(بقیہ صفحہ ۱۹۵) شعلہ مزاج انہوں نے ریاض کو ڈانٹا اور کہا کہ دماغ خراب ہوگیا ہے کیا! معلوم ہے کس سے بات کر رہے ہو اور کس سے مخاطب ہو، تمہارے استاد کے محب خاص اور برادر بجاں برابر ان کا ادب و احترام کرنا تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح اپنے استاد کا۔ معافی مانگو، ریاض کی کیا مجال تھی کہ مولوی صاحب کے سامنے دم مارتے صرف اتنا کہا کہ حضرت پہلے تو انہوں نے ہی چھیڑ کی، میں نے تو صرف جواب دیا تھا، مگر مولوی صاحب کہاں ماننے والے تھے اسی وقت ریاض سے معذرت کرائی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، امیر مینائی جب اندر سے واپس آئے تو ان کو اس کا علم نہ ہو سکا گھر پہنچکر پتہ چلا، ان کی پاکیزہ نفسی دیکھئے اسی وقت سواری منگوائی اور ریاض کو ساتھ لے کر مرزا داغ کے یہاں پہنچے، ریاض سے مکرر معافی منگوائی اور خود بھی معذرت کی کہ میرے شاگرد نے یہ گستاخی کی کہ میرا سر شرم و ندامت سے خم ہے تم محب خاص ہو مجھے بھی معاف کر دو۔ (میخانۂ ریاض از تسنیم مینائی صفحہ ۴۷، ۴۸)

ہیں، انہوں نے آجکی نشست میں مرزا صاحب کے جہاں اور بہت سے واقعات بیان کئے ایک واقعہ بڑا دلچسپ سنایا :-

انہوں نے بتایا کہ اختر جان طوائف جو مرزا صاحب کی منظور نظر تھیں آئے دن مرزا صاحب سے برگشتہ خاطر ہو کر ملازمت چھوڑ بیٹھتی تھیں اور ان کا آنا جانا ترک ہو جاتا تھا، ہر دفعہ بعض احباب درمیان میں پڑ کر پھر مصالحت کرا دیتے تھے مرزا صاحب کو اس نو عمر اور چنچل طوائف سے کچھ ایسی دلبستگی تھی کہ اس کے روٹھ جانے سے وہ بڑے دل شکستہ ہو جایا کرتے تھے اور زندگی بڑی حد تک اداس و فسردہ ہو جایا کرتی تھی، واقعہ دراصل یہ تھا کہ اختر نو عمر ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بھی بلا کی تھی اور اپنے حسن و جمال کی بنا پر حیدر آباد میں بہت مقبول تھی بعض لوگوں سے اس کے جنسی تعلقات بھی رہ چکے تھے، مرزا صاحب گو ان باتوں کے لئے سختی سے مانع نہیں تھے لیکن بہر نوع وہ طبعاً اسے پسند نہیں کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً اسے دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتے رہتے تھے وہ جوش جوانی میں ایسی اندھی ہو رہی تھی کہ مرزا صاحب کی ان باتوں کو گرہ کرنے کے بجائے یہ خیال کرتی تھی کہ مرزا صاحب اپنی کسی ذاتی نفسانی غرض کی بنا پر ایسا فرمایا کرتے ہیں، ایک دفعہ اس نے حسب معمول آنا جانا ترک کر دیا. مرزا صاحب کے ملازموں اور دوسرے لوگوں

کے آنے جانے کے باوجود جب وہ کسی طرح آنے پر آمادہ نہیں ہوئی تو تھک کر مرزا صاحب خاموش ہو گئے مگر افسردگی نہ گئی اور ان کی وہ خوش مزاجی ہوا ہو گئی، میں اکثر انہیں سمجھاتا تھا وہ مجھ سے کہا کرتے کہ پہلے تو ہماری عادت تھی کہ ہم حسینوں کی بے وفائی کا کبھی اثر نہیں لیا کرتے تھے، ایک سے اگر قطع تعلق ہوا تو دوسرے سے واسطہ پیدا کر لیا، ایک سے اگر دل نہیں ملا تو دوسری طرف متوجہ ہو گئے، کبھی کسی ایک کی پروا نہیں کی اور بمصداق ؎

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

ہمیشہ کسی کی جدائی کا اثر نہیں لیا اور طبیعت کو خوش رکھا لیکن اب اس عمر میں یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جس سے وابستگی ہو جاتی ہے اس سے ایسا لگاؤ ہو جاتا ہے کہ اس سے ترک تعلق پر دل کڑھتا ہے، اختری سے واقعی کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا ہے کہ جس روز اس کو نہیں دیکھا، اس کا گانا نہیں سنا دل بے چین سا رہتا ہے، مرزا صاحب کی اس پریشاں خاطری کا جب مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد کو علم ہوا تو انہیں بہت افسوس ہوا، انہیں مرزا صاحب سے بہت محبت تھی، انہوں نے آدمی بھیجکر اختر جان کو بلوایا اور وجہ پوچھی، اختر جان انے

مرعوب ہو کر اور تو کچھ نہ کہہ سکی یہ بولی کہ مرزا صاحب مجھے سو روپیہ دیتے ہیں اس میں میری گزر نہیں ہوتی، مہاراجہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو آج سے سو روپیہ ماہوار ہمارے یہاں سے ملیں گے تم فوراً مرزا صاحب کی خدمت میں پہونچو، اختر جان اسی روز شام کو مرزا صاحب کے مکان پر حاضر ہوئیں بہت شرمندہ اور محجوب، جھکی جھکی نظروں سے مرزا صاحب کو سلام کیا میں اسوقت مرزا صاحب کے پاس موجود تھا، مرزا صاحب نے بڑی دیر تک اختر سے کوئی بات نہیں کی، میں اس سے باتیں کرتا رہا، میں نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت گانا سنئے گا، مرزا صاحب کئی دن کے بھرے بیٹھے تھے، بولے پہلے ان بی صاحبہ سے یہ پوچھئے کہ یہاں کیا قصور ہوا تھا جو آج تقریباً ایک ہفتے سے وہ غائب تھیں مجھ سے یہ کہکر اختر کی طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

ایسی کیا بو سما گئی تم کو ہم سے جو اس قدر دماغ ہوا

اختر جان خاموش سر جھکائے بیٹھی تھیں کچھ کہتے بن نہ پڑتی تھی کچھ دیر اور خاموشی رہی، اس کے بعد اختر جان کو مرزا صاحب نے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا، اختر جان اٹھیں اور انکے پاس جا بیٹھیں وہ اس وقت بھی اپنا سر بدستور جھکائے تھیں مرزا صاحب نے ان کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ان کا چہرہ اوپر اٹھایا

اور یہ شعر پڑھا ؎

جلانا داغ کا اچھا نہیں یہ دم غنیمت ہے
کہ ایسا بادخوار آدم نکلے گا زمانے میں

اختر جان ہنسنے لگیں اور مرزا صاحب ان سے چھیڑ چھاڑ و تفریح میں مصروف ہو گئے، کچھ دیر بعد اختر جان بھی کھل گئیں اور شکوے شکایات کرنے لگیں اس روز اختر کا گانا نہیں سنا گیا بلکہ مرزا صاحب اسی قسم کی تفریح کرتے اور دل بہلاتے رہے

یکم اپریل ۱۹۰۳ء

مرزا صاحب کے یہاں ایک شیخ جی نوکر ہیں دلی کے رہنے والے ہیں بڈھے، فقرا کے دلدادہ، دنیا میں کوئی ایسا ولی نہیں جس کا انہیں نام اور حال نہ معلوم ہو، حیدرآباد میں جن بزرگوں کے مزار ہیں وہاں ہر جمعرات کو جاتے ہیں اور شب وہیں بسر کرتے ہیں، آج صبح کے وقت مرزا صاحب کے پاس آئے، ان کے پاس ایک طوائف بیٹھی ہوئی تھی جو نام سن کر سلام کرنے آئی تھی، طوائف کے اٹھ جانے کے بعد شیخ جی جیسی ان کی عادت تھی مرزا صاحب کو نصیحتیں کرنے لگے کہ آپ اب ان چڑیلوں کا پیچھا چھوڑیئے، آپ اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہیں، مرزا صاحب ان کی ایسی باتوں کو زیادہ تر پی جایا کرتے، آج جب بہت دیر تک شیخ جی مرزا صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہے تو مرزا صاحب

ہنسے اور فرمایا کہ شیخ جی عاقبت کی فکر نہ کیجئے میں نے وہاں کیلئے جواب سوچ لیا ہے یہ کہہ کر برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

کہہ دیں گے ہم تو داور محشر سے صاف صاف
اچھوں کو دل نے پیار کیا ہم نے کیا کیا

یہ سن کر شیخ جی جھلا کر مرزا صاحب کے پاس سے اٹھ گئے، شیخ جی کے چلے جانے کے بعد مرزا صاحب نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

کیا ہے ناک میں دم واعظوں نے کیا کہئے
غضب ہے دین کا دنیا میں نام لیتے ہیں

صبح کا وقت تھا، مرزا صاحب آرام کرسی پر دراز ہیچوان پی رہے تھے، نوکر کو آواز دی اور اس سے کہا کہ چاندنیاں میلی ہو گئی ہیں، انہیں بدلو، نوکر نے کہا کہ چاندنیاں ابھی تک دھوبی کے یہاں سے نہیں آئی ہیں آج ہندوؤں کا کوئی تیوہار ہے، مرزا صاحب بولے ہندوؤں کے تیوہار سے اور چاندنیوں سے کیا تعلق، نوکر بولا کہ حضور یہاں کی دھوبنوں کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اس تیوہار کے موقع پر چاندنیاں باندھا کرتی ہیں، مرزا صاحب ہنسے اور بولے کہ "ہائے ہم ہندو نہ ہوئے"۔

۳ر اپریل ۱۹۰۲ء

رات کو حبیب کنتوری کے یہاں مشاعرہ تھا، مرزا صاحب بھی شریک

ہوئے، حبیب کنتوری نے غزل پڑھی جس کی ردیف اور قافیہ "سفر سے پہلے، حضر سے پہلے" تھا، ایک شعر جس میں سفر کا قافیہ باندھا تھا، بہت زور دے کر پڑھا اور فرمایا کہ کوئی دوسرا اگر ایسا شعر لگائے تو خون تھوکنے لگے ——— مرزا صاحب یہ جملہ سن کر مسکرائے اور بولے کہ "ہم تو اس زمین پر تھوکتے بھی نہیں"، مرزا کے اس جملے پر مشاعرے میں ہنسی کی ایک لہر دوڑ گئی اور حبیب صاحب بہت خفیف ہوئے،

⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂

۵ر اپریل ۱۹۰۲ء

آج بہت دیر تک استاد ذوق کا ذکر ہوتا رہا، مرزا صاحب نے بتایا کہ ایک دن صبح کے وقت خاقانیٔ ہند حضرت ذوق مرحوم بیٹھے ہوئے تھے شاگردانِ رشید اُن کے چاروں طرف جمع تھے، انگیٹھیاں روشن تھیں یکایک استاد نے شاگردوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ، مصرع،

مہر تو مشعل نما اک روشنی والوں میں ہے

اس مصرع پر جو مصرع لگائیگا وہ شعر اسی کو دیدیا جائیگا مگر شرط یہ ہے کہ مطلع ہو، سب شاگرد فکر کرنے لگے، میں بھی فکر میں تھا، اتفاق کی بات میرے دماغ میں اوروں سے پہلے مصرع آگیا اور استاد سے عرض کرنے کی اجازت چاہی، اجازت ملی تو میں نے عرض کیا سے

وہ بھبھوکا ایک ہی آتش کے پرکالوں میں ہے
مہر تو مشعل نما اک روشنی والوں میں ہے

استاد شعر سن کر پھڑک گئے، اٹھ کر گلے سے لگا لیا اور فرمایا، تم ضرور اپنے استاد کا نام اچھالو گے، حضرتِ ذوق کی پیشین گوئی، لفظ بہ لفظ پوری ہوئی، استاد اگر خاقانیٔ ہند تھے تو شاگرد فصیح الملک جہاں استاد ہوئے ذوق اگر شاہِ دہلی کے استاد ہوئے مرزا داغ والیٔ دکن کے استاد ہوئے اگر غور کیا جائے تو مرزا داغ نے ذوق سے زیادہ شہرت پائی انہیں مملکت سخنوری کا بلا شبہ تاجدار کہا جا سکتا ہے، انہوں نے قدیم طرزِ شاعری میں جو سوز و ساز اور سادگی و پرکاری کی روح پھونکی اس کا زمانہ معترف ہے۔

۶/ اپریل سنہ۱۹۰۲ء

آج کی ڈاک میں کشن کوٹ کے ایک رئیس[1] کا بھی ایک خط تھا جو مرزا صاحب کے شاگرد ہیں، لکھا تھا کہ میں نے اعلیٰ درجہ کی مفرح مقوی کیسی اور کیسی شراب کھچوائی ہے اگر آپ پینا شروع کر دیں تو دو چار درجن بوتلیں بھجوا دوں، مرزا صاحب نے اس خط کے جواب میں لکھوایا کہ:۔

افسوس تم نے تفریح کی صرف ایک چیز بھیجنے کی اجازت چاہی ہے لیکن دوسرے سامانِ نشاط کا ذکر بھی نہیں کیا، جو اگر سچ پوچھو تو لازمۂ شراب خوری ہے، میں اکیلی شراب لے کر کیا

---

[1] ان کا نام بیر برھا کر ہر پرشاد تھا، بیدار تخلص تھا شاعر تھے اور داغ سے اصلاح لیتے تھے، مرزا داغ جب پنجاب تشریف لے گئے تو ان کے یہاں بھی گئے تھے کشن کوٹ پنجاب میں ایک ریاست ہے یہ اسی ریاست کے رئیس تھے۔

جاؤں گا، اب تک جب نیت ڈانوا ڈول نہیں کی تو پھر تنہا شراب کی خاطر کیوں ایمان خراب کر دوں اس کے ساتھ کچھ اور سامان بھیجو بغیر اس کے مجھے کیا لطف آئے گا۔

آج ایک صاحب مدراس کے ملنے آئے، جو یہاں اپنے کسی عزیز کے یہاں آئے ہوئے ہیں، نام بھلا سا بتایا جو یاد نہیں رہا۔ تعارف کے بعد پوچھنے لگے کہ آپ دہلی کے کون سے محلے کے رہنے والے ہیں مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی میں دلّی کا رہنے والا ہوں، ترکمان دروازے کا نہیں، لاہوری دروازے کا نہیں، اجمیری دروازے یا پھلی والان کا نہیں بلکہ چاندنی چوک کا "شہدا" ہوں۔

۸؍اپریل ۱۹۰۲ء

آج مرزا خورشید عالم نے فرمایا کہ اس دفعہ جب میں حیدر آباد سے دلّی جا رہا تھا تو بھوپال سے نکلنے کے بعد کچھ لوگ ریل میں سوار ہوئے مجھ سے پوچھا کہاں سے آرہے ہو، میں نے کہا حیدر آباد سے، کہنے لگے تم مرزا داغ کو جانتے ہو، میں نے کہا ہاں، ان مسافروں میں سے ایک نے مرزا صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

پوچھئے مے کشوں سے لطفِ شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں

شعر پڑھ کر سوال کیا کہ کیا داغ شراب پیتے ہیں، میں نے کہا، نہیں، میرے اس کہنے پر انہیں سخت حیرت ہوئی، بولے آپ غلط کہتے ہیں، بھلا مرزا داغ جیسا حسن پرست و شاہد باز جس کی زندگی عبارت ہے حسن پرستی سے کیا وہ شراب سے دور رہ سکتا ہے، شراب عیاشی کا جزو اعظم ہے، میں نے ان لوگوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر انہیں یقین نہ آیا، انہوں نے اور بھی مرزا صاحب کے کچھ شعر سنائے جن میں شراب کے مضامین موجود تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ اگر کسی شاعر کے کیریکٹر کا اندازہ صرف اس کے کلام سے کیا جانا ممکن ہو تو پھر کسی ایک شاعر کو نہ صرف یہ کہ شراب خوار تسلیم کرایا جا سکتا ہے بلکہ خدا کا منکر بھی اسے ثابت کیا جا سکتا ہے اور اس ثبوت میں مَیں نے مختلف اشعار مختلف شعرار کے سنائے اور ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا، دیر تک وہ مرزا صاحب کے کمالِ شعر کی تو داد دیتے رہے لیکن شراب نوشی کے متعلق جو خیال ان کا تھا وہ بدستور رہا اور میں باوجود کوشش ان کے عقیدے کو متزلزل نہ کر سکا۔

مرزا خورشید عالم جب پورا واقعہ سنا چکے تو مرزا صاحب بولے کہ بھائی مشہور ہے کہ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے لیکن مجھ بدنصیب نے تو مفت کی بھی نہیں پی، اتنا فرما کر یہ شعر پڑھا ؎

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز
داغ لیکن شراب خوار نہیں

مرزا صاحب کی شاہد بازی اور عیش مزاجی کے واقعات کے مواجہہ میں اگر ان کی شاعرانہ شوخیوں اور پر کیف معاملہ بندیوں پر غور کیا جائے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے ممزوج کیا جائے تو واقعی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کا دامن ضرور شراب سے آلودہ ہوگا۔[1] ان کا یہ شعر ؎

کچھ نہ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہوگئی ہے

صاف بتاتا ہے کہ اس شعر کا خالق ان لذات و کیفیات میں ڈوبا ہوا ہے جسے ایک دائم الخمر ہی جان سکتا ہے، لیکن روایت و رویت، تخمین و یقین اور تخیلات و مشاہدات میں خواب اور بیداری کا فرق ہے، جس نے بچشم خود ایک دو دن نہیں، برسوں شبانہ روز کی صحبتوں میں یہ رنگ نہ دیکھا ہو اور اس کا شائبہ بھی نہ پایا ہو وہ ان سب باتوں کو قیاسی وافواہی خیال کرنے پر مجبور ہے، مرزا داغ کی وہ کون سی کھلی اور ڈھکی ہے جو ان کے مخصوص احباب و شاگردوں سے چھپی ہے۔ ان کی تمام حسن پرستانہ کارگزاریاں اور شاہد نوازانہ سلسلہ جنبانیوں سے انکے بے تکلف اور حاضر باش احباب

---

[1] عام خیال کے مطابق ہو سکتا ہے کہ مرزا داغ شراب کے عادی نہ ہوں لیکن اگر کسی شاعر کے بعض اشعار حقیقت پر غماز ہو سکتے ہیں تو داغ کا صرف یہ ایک شعر غمازی کر رہا ہے کہ وہ کسی دباؤ سے مجبور ہو کر زیادہ نہیں تو ایک دفعہ ضرور آلودۂ شراب ہوگئے تھے، شعر ملاحظہ ہو ؎

یہ داغ رند جو آلودۂ شراب نہ تھا   خراب آج ہوا آج تک خراب نہ تھا

واقف ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر مرزا صاحب اس علت میں بھی گرفتار ہوتے تو ہم اس سے آگاہ نہ ہوتے۔ ان کی ان تمام کارگزاریوں کا ذکر ان اوراق پر کیا جا رہا ہے جو شراب خواری جیسے عیب سے کسی طرح کم نہیں تو پھر اگر مرزا صاحب شراب خوار ہوتے تو اس کے ذکر و اعادے سے کیوں گریز کیا جاتا۔

---

۹ / اپریل ۱۹۰۲ء

آج بڑی دیر تک مرزا صاحب اسیر کا ذکر کرتے رہے، ان سے جو تعلقات بہ زمانۂ قیام رامپور مرزا صاحب کے رہے ان کو بیان فرماتے رہے، اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ میں جناب اسیر سے ملنے کے لئے گیا کیا دیکھا کہ ایک کوٹھری میں بیٹھے ہوئے ہیں اندر داخل ہونے کی بجائے باہر دروازے پر ہی کھڑا رہا، اسیر نے کہا اندر تشریف لائیے، میں نے باہر سے جواب دیا کہ حضرت میں حبس میں نہیں آتا، یہ آپ ہی کو مبارک رہے، اسیر ہنس کر باہر نکل آئے،

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں جس قدر تجربات رام پور کے زمانہ قیام میں حاصل کئے کبھی نہیں کئے، رام پور نے میری زندگی کو سانچے میں ڈھال دیا اور میرے سارے کس بل نکال دیئے انہوں نے فرمایا کہ گو فردوس مکان نواب یوسف علی خاں کے زمانے سے رام پور میں شعر و سخن کا چرچا تھا، مگر خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے

زمانہ میں اسی چرچے نے گرم بازاری کی شکل اختیار کرلی اور شاعری کے ساتھ شاعر نوازی حد کمال کو پہنچ گئی، دہلی اور لکھنؤ کے تمام باکمال رام پور میں جمع تھے اور ان میں سے اکثر وابستۂ ریاست تھے، انکی آپس کی ادبی چشمک اور شاعرانہ کد وکاوش نے رام پور میں ایک عجیب ماحول پیدا کر دیا تھا اور مشاعروں میں بڑی گھما گھمی رہا کرتی تھی۔

مرزا صاحب نے بتایا کہ رام پور میں سب سے پہلے میں نے صاحبزادہ محمد رضا خاں صاحب کے مشاعرے میں غزل پڑھی تھی، جس کا مطلع تھا

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں

رام پور میں کبھی کبھی خاص نواب صاحب کی طرف سے بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے، اگرچہ نواب صاحب بذات خود شریک نہیں ہوتے تھے، مگر مشاعرہ ریاست ہی سے نامزد ہوا کرتا تھا، ایسے مشاعروں کا انتظام وانصرام میرے سپرد ہوا کرتا تھا، مجھے اتنی مصروفیت ہوتی کہ اکثر مشاعرے کا انتظام کرتے پھرتے ہی غزل کہنی پڑتی تھی، لیکن خدا کی دین کا یہ عالم کہ اس روا روی میں کہی ہوئی غزل بھی مقبول ہوئے بغیر نہ رہا کرتی تھی،

۱۲؍اپریل ۱۹۰۳ء

میں بعض اوقات مرزا صاحب کے پاس کھانا کھاتا ہوں، مرچیں

میں بہت کم کھاتا ہوں، مرزا صاحب کو یہ معلوم تھا، آج مذاق کے طور پر ایک مرچ اٹھا کر مجھے دی اور فرمایا کہ اسے کھاؤ، میں نے تعمیل حکم کی تو بیتاب ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، بہت ہنسے فرمانے لگے کہ لو یہ قلاقند کھاؤ۔

مرزا صاحب بڑے خوش خوراک ہیں، دسترخوان پر ہمیشہ چار پانچ قسم کے کھانے ضرور ہوا کرتے ہیں، سادہ قورمہ، قلیا اور کباب عام طور سے کھاتے ہیں، مرغ کے کبابوں کا اتنا شوق ہے کہ ایک دفعہ میں پورا ایک مرغ اڑا جاتے ہیں، دو چار مہمان ہمیشہ دسترخوان پر موجود رہتے ہیں، پکوان کا بھی بہت شوق ہے، پر خوراک بھی ایسے ہیں کہ جو چیز سامنے آگئی اس کے کھانے میں ذرا تکلف نہیں کرتے خاص خاص میووں سے بھی شوق ہے، انگور کی پیٹیاں کی پیٹیاں خالی کر دیا کرتے ہیں تیتر، بٹیر، لوے، مرغے اور مرغیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں اور دو چار کی گردنوں پر روز چھری پھرا کرتی ہے، چنے، سیو، مکا کے بھٹے اور پاپڑ سے بھی بہت شوق ہے، مرچیں دلی والوں کی مشہور ہیں چنانچہ مرزا صاحب بھی بہت مرچ کھاتے ہیں ہمیشہ بواسیر کی شکایت کرتے ہیں مگر زیادہ مرچ کھانا ترک نہیں کرتے، مونگ کی کھچڑی کا بہت شوق ہے، دن کا کھانا عام طور سے ۱۲ اور ۱ بجے کے درمیان کھاتے ہیں، رات کا کھانا عشا کی نماز کے بعد تناول فرماتے ہیں، تنہا کھانا کبھی نہیں کھاتے اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تو کھانے کے وقت حاضر باشوں میں سے ہی کسی کو

شریک کر لیا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ کھانا کھانے میں بہت خوش ہوتے ہیں۔

۱۵ / اپریل ۱۹۰۲ء

باتوں باتوں میں مرزا صاحب نے فرمایا کہ مجھے ابتدائی عمر میں ورزش کا بہت شوق تھا، مگدر پھرانے کی مشق بہت ہی بڑھی ہوئی تھی، گھوڑے کی سواری معمول میں داخل تھی، سب شوق ختم ہو گئے مگر گھوڑے کی سواری کا شوق اب بھی کچھ باقی ہے، لیکن صحت کی خرابی اس شوق میں حائل ہے۔

مرزا صاحب بہت کم گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں لیکن اس عمر میں بھی جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں تو ان میں جوانوں کے سے دم خم پائے جاتے ہیں، خدا نے ڈیل ڈول ایسا دیا ہے کہ گھوڑا بھی دب جاتا ہے بلند بالا، فراخ سینہ، ہاتھ پاؤں مضبوط، سینکڑوں میں وہی نظر آتے ہیں، دو گھوڑے مستقل تھان پر بندھے ہیں، ہر گھوڑے پر ایک سائیس مقرر ہے، گھوڑوں کی خوراک وغیرہ کا خاص اہتمام ہے، اکثر سائیسوں کو مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ اس طرح گھاس کھلائی جائے اور اس طرح دانہ دیا جائے، اس طرح مالش کی جائے اور اس طرح تھان کی صفائی کی جائے، کبھی کبھی خود بھی رات کے وقت گھوڑوں کے پاس جا کر ملاحظہ کرتے ہیں۔

۲۱ر اپریل ۱۹۰۲ء

آج مرزا صاحب بہت سست سست نظر آتے تھے، شام کو میر ردانی علی تشریف لائے اور وجہ افسردگی پوچھی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب سے حجاب آئی ہیں بجز ان کے دوسری صحبت نہیں رہی ہے، مجرا سن کر دل بہلا لیا کرتے تھے وہ بھی ختم، کبھی کبھی کوئی طوائف سلام کے لئے آجاتی ہے تو وہ بھی ان کو ناگوار ہے بتاؤ جس شخص کی گھٹی میں حسن پرستی اور نغمہ پرستی ہو وہ کس طرح قید و بند کو برداشت کر سکتا ہے، بڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں بالآخر خود سوچ کر بولے اچھا یار ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ اپنے دوستوں کے یہاں مجرے ہوا کریں، روپیہ ہم صرف کریں اور نام ہو یاروں کا۔

ـــــــــــ

۲۷ر اپریل ۱۹۰۲ء

آج سہ پہر سے شام تک مرزا صاحب پتنگ بازی دیکھتے رہے کبھی خود بھی پتنگ اڑایا کرتے تھے، مگر اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ صحن مکان میں بیٹھے بیٹھے مرزا خورشید عالم کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھ لیا کرتے ہیں مرزا صاحب کو قریب قریب تمام بازیوں کا کم و بیش شوق رہا ہے، بٹیر بازی کبوتر بازی گو خود نہیں کرتے لیکن دوسروں کے شغل میں شریک ضرور ہو جایا کرتے ہیں۔ موسیقی سے تو انہیں فطری لگاؤ ہے اور اس مذاق کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر واجد علی شاہ ہیں۔

ستار نواز، بین نواز، گویئے، ڈوم، ڈھاری اور ان سب کی پیشوا رنڈیاں ان کی صحبت کا لازمہ ہیں، طبلہ خود بھی بجاتے ہیں، ستار میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، دو تین راگ راگنیاں خود بھی ایجاد کی ہیں، شاہ ظفر کا ایجاد کیا ہوا ایک راگ بہت بجاتے ہیں، حیدرآباد کے قیام میں ایک رنڈی ہمیشہ ان کے پاس ملازم رہی، الغرض یہ کہ مرزا صاحب کے شب و روز عیش میں گزرتے ہیں، منی بائی حجاب کے آنے کے بعد گو ان کا پروگرام بالکل بدل چکا ہے، لیکن ان کی تشریف آوری سے پہلے کون سا دن تھا جو ان رنگ رلیوں میں نہیں گزرتا تھا،

مغرب کا وقت گزرا اور گانا سننے کا دل چاہنے لگا، ستار نواز نوکر ہے اس کو بلایا اور کہا کہ گا بجا، اس وقت شہر کے طائفے بھی آجاتے، دکنی طائفوں کا انہوں نے کبھی گانا نہیں سنا، لیکن دو ایک طوائفیں دکنی بھی آجایا کرتی تھیں، گھنٹوں ان سے ہنسی مذاق رہا کرتا تھا، سورت کی ایک طائفہ اختر جان کوئی دو برس تک سو روپیہ[1] ماہوار پر نوکر رہی دکن میں وہ حور سمجھی جاتی تھی، خوش اندام، خوش رو، خوش وضع، خوبصورت، میانہ قد، مضطر ایسی کہ ایک جگہ اسے قرار نہ تھا، اس کی ادائیں مرزا صاحب کے دل میں گھر کر گئیں تھیں ورنہ —— کے

---

[1] اختر جان مرزا صاحب سے اکثر ناراض ہو جایا کرتی تھی اور مرزا صاحب کو اسکے چلے جانے کے بعد بہت تکلیف ہوتی تھی لہذا سو روپیہ ماہوار مہاراجہ کشن پرشاد صاحب اختر جان کو اپنے پاس سے دینے لگے تھے تاکہ وہ کمی تنخواہ کی بنا پر ملازمت نہ چھوڑے۔

لائق مرزا صاحب کا سن نہیں تھا، اختر جان کچھ عرصے کے بعد حیدرآباد سے سورت چلی گئی، مرزا صاحب اس کی فرقت میں دل شکستہ رہنے لگے لیکن حجاب کے آنے کے بعد اب یہ دنیا سب خاموش اور معطل ہے۔

---

۲۹ /اپریل ۱۹۰۰ء

آج مرزا صاحب نے اپنے والد کے پھانسی پانے کے سلسلہ میں مرزا غالب کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا، انہوں نے فرمایا کہ سر ولیم فریزر ایجنٹ ایک عیاش اور آوارہ انگریز تھا اور وہ عام طور سے ہندوستانی مستورات سے ملتفت رہا کرتا تھا، میرے والد نواب شمس الدین خاں اور فریزر مذکور سے ہمیشہ اختلاف رہا اور اسی اختلاف کی بنا پر وہ قتل کیا گیا، اس کے قتل کا قصہ مرزا صاحب نے یہ بتایا کہ نواب صاحب نے اپنے داروغۂ شکار کریم خاں اور ایک مینا قوم کے آدمی کو جب متعین کیا تو غلطی سے اپنی بندوق بھی ان کو دیدی، یہ دونوں فریزر کی قیام گاہ سے ذرا فاصلہ پر ایک پیپل کے درخت پر بیٹھ گئے، فریزر اس روز راجہ کشن گڑھ کے یہاں مدعو تھا، رات کے وقت شراب میں سرشار جب وہ واپس ہوا اور اس درخت کے پاس پہونچا تو کریم خاں نے بندوق داغ دی جو نشانے پر بیٹھی اور فریزر وہیں ڈھیر ہو گیا کریم خاں درخت سے اتر کر نواب صاحب کی کوٹھی واقع دریا گنج پہونچ گیا اور مینا جو ایک تندرست اور مضبوط انسان تھا، راتوں رات نوّے میل کا سفر

کر کے نواب صاحب کے پاس پہونچا اور فریزر کے قتل کی خوشخبری سنائی کریم خاں نے گھبراہٹ میں ایک حماقت یہ کی کہ بندوق ایک کنوئیں میں ڈال دی، شہر میں آناً فاناً خبر ہو گئی، شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اور قاتل کی نہایت زور شور سے تلاش شروع ہو گئی، لیکن قاتل کا کوئی پتہ نہ چلا، پچاس ہزار روپیہ کے انعام کا بھی اعلان ہوا نواب صاحب اور فریزر کے تعلقات خراب تھے، ادھر ان کے سوتیلے بھائی اور دوسرے اہل خاندان بھی مخالف تھے، لہذا نواب صاحب کا نام لے دیا گیا اور اس عینا کو اقرار پر مجبور کر کے حاضر کرایا گیا جس نے نہ صرف پورا واقعہ بیان کیا بلکہ بندوق بھی کنوئیں سے برآمد کرا دی جس پر نواب صاحب کا نام کندہ تھا۔ نواب صاحب اور کریم خاں کے خلاف مقدمہ چلا نتیجے میں پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔

اس واقعہ سے مرزا غالب کا تعلق اس طرح رہا کہ مرزا غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ جو سمرقند سے آئے تھے، مرہٹوں کے ہم نوا ہوئے اور ان کو بلند شہر کے ضلع میں پھاسنو کا تعلقہ مل گیا، انہیں قوقان بیگ کے ایک لڑکے عبداللہ بیگ خاں ہوئے جن سے غالب پیدا ہوئے۔ جب انگریز دہلی پر قابض ہوئے تو بھی مرزا کے بزرگ خیرخواہ رہے جن کے صلے میں ان کو سونسا اور سونک کے پرگنے مل گئے، جو ایک مدت تک مرزا کے خاندان میں رہے، بعد میں انگریزوں نے اپنی حکومت میں شامل کر لئے اور مرزا کے خاندان کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ مقرر

کر دیئے گئے چونکہ مرزا غالب کے چچا کی شادی نواب احمد بخش والئ فیروز پور جھرکہ کی بہن سے ہوئی تھی، لہذا یہ پنشن بھی اسی ریاست کے ذمہ کر دی گئی جو کچھ عرصے ضرور پوری ادا ہوئی اس کے بعد اس میں سے بقدر نصف تخفیف ہو کر ایک دوسرے شخص کے لئے مشخص ہو گئی یہ چیز مرزا غالب وغیرہ کو ناگوار گزری اور مرزا غالب نے فریزر کے بل بوتے پر مقدمہ لڑا احمد بخش خاں اپنی ریاست بیٹوں کو دے کر خانہ نشین ہو چکے تھے اور ان کے ورثار میں سخت اختلاف تھا اور چونکہ نواب شمس الدین خاں ریاست کے سربراہ تھے لہذا مرزا غالب کا مقدمہ ان ہی کے خلاف دائر ہوا مگر بوجوہ چند در چند وہ مقدمہ خارج ہو گیا اور اس طرح مرزا غالب کو نواب شمس الدین خاں سے پوری پوری مخالفت ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ فریزر کے قتل کے سلسلے میں انگریزوں نے جو چغلخوریاں[1] کی گئیں ان میں مرزا غالب

---

[1] مرزا غالب نے نواب شمس الدین خاں کے پھانسی دلانے میں سازش کی ہو یا نہ کی ہو بہر حال اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ وہ نواب شمس الدین خاں سے ناراض ضرور تھے جس کے ثبوت میں خود ان کی یہ تحریر ملاحظہ ہو :-

"بفرمان جنرل لارڈ لیک بہادر منظوری گورنمنٹ ہشت زر سے شامل جاگیر عم بسعی من نواب احمد بخش خاں بہادر در وجہ معاش من قرار یافت چوں جانشین احمد بخش خاں کیفر کردار یافت و جاگیر بہ سرکار بازیافت شد رسیدن آں وجہ مقرر سے از خزانہ کلکٹری دہلی صورت پذیرفت"

(ذکر غالب ص ۲۸-۲۷)

کا بھی حصہ تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، میں نے مرزا غالب کی شاعرانہ اہلیت اور تجربے کے پیش نظر ہمیشہ ان کی عزت کی اور انہوں نے میرا خیال کیا۔

---

۳ رمئی ۱۹۰۳ء

منی بائی حجاب اپنی ڈھلتی عمر کے باوجود بہت تیز مزاج اور گرم گفتار ہیں، اپنے اور مرزا صاحب کے معاملات میں دوسروں کی مداخلت بہت کم پسند کرتی ہیں، مرزا صاحب ازلی حسن پرست ہیں نغمہ وحسن ان کے لوازمات حیات میں داخل ہیں، انہیں گانا سنے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا، گو حجاب کے آنے کے بعد سے رقص وسرود کی محفلوں میں پہلی جیسی ہنگامہ آرائی اور باقاعدگی نہیں رہی ہے بایں ہمہ جب بھی موقعہ ملتا ہے مرزا صاحب گانا سنے بغیر نہیں رہتے اور یہ چیز بی حجاب کو سخت ناگوار ہے۔

مرزا صاحب پر بی حجاب بڑی حد تک حاوی ہیں اور یہ چیز مرزا صاحب کے اعزہ کو سخت ناگوار ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے کہ حجاب اور مرزا صاحب کے اعزا، میں اختلاف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، مرزا صاحب ایسے مواقع پر عام طور سے خاموش رہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک طرف جہاں حجاب ان پر چھا جانے کے لئے کوشاں ہیں وہیں انکے اعزا، کی یہ تمام ترکاوشیں اس بنا پر ہیں کہ کہیں منی بائی حجاب مرزا صاحب کو اتنا متاثر نہ کرلیں کہ وہ لوگ مرزا صاحب کی نگاہوں سے گر جائیں اور جو فائدے مرزا صاحب کی ذات سے یہ لوگ اٹھا رہے

ہیں ان سے وہ محروم ہو جائیں، دوسری طرف منی بائی حجاب کے کچھ متعلقین حیدر آباد پہنچ چکے ہیں، مرزا صاحب بعض وجوہ کی بنا پر ان لوگوں کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکے، یہ سب لوگ کلکتے میں درحقیقت منی بائی حجاب کے دست نگر تھے اور حجاب ہی کی آمدنی سے گزر بسر ہوتی تھی حجاب کے حیدر آباد چلے جانے کی بنا پر ان کا حال پتلا تھا، مرزا صاحب کی اجازت سے ان لوگوں کو حجاب نے کلکتے سے بلا لیا، ان لوگوں کو علیحدہ کرایہ کا مکان لے کر رکھا گیا ہے۔ بی حجاب مرزا صاحب ہی کے ساتھ رہتی ہیں ان سب کی گزر بسر مرزا صاحب ہی کے پیسوں سے ہوتی ہے، علاوہ انکے اخراجات برداشت کرنے کے مرزا صاحب، حجاب کو سو روپیہ ماہوار اور دیتے ہیں جو وہ اپنے ان اعزہ ہی پر صرف کرتی ہیں، الغرض اس وقت مرزا صاحب کی زندگی بڑے سکون و اطمینان سے گزر رہی ہے بجز اس کے کہ ان کو اب پہلے کی طرح آزادی سے دوسری طوائفوں کے مجرے سننے اور ان سے دل بہلانے کے مواقع نہیں ملتے باقی راوی چین لکھتا ہے۔

۱۵ ; مئی ۱۹۰۲ء

آج شام کو مرزا صاحب کے یہاں منی بائی حجاب کے فوٹو کھچنے کا اہتمام تھا، بڑی زبردستیوں سے حجاب فوٹو کھچوانے پر آمادہ ہوئی تھیں، مرزا صاحب بضد تھے کہ دونوں کا فوٹو ایک جگہ ہونا چاہئے، حجاب کو اس پر اعتراض تھا، فوٹو گرافر مکان پر موجود اور عاشق و معشوق میں جھگڑا ہو رہا ہے،

کوئی فیصلہ نہیں ہوتا آخر فوٹو گرافر نے اس جھگڑے کو اس طرح ختم کیا کہ مرزا صاحب کو اشاروں میں کچھ سمجھا دیا، مرزا صاحب حجاب کی کرسی سے کچھ ہٹ کر پیچھے بیٹھ گئے، فوکس لیا گیا، منی بائی کو بھی یقین رہا کہ صرف میرا فوٹو لیا جا رہا ہے لیکن فوٹو گرافر نے باہر آ کر مرزا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ عاشق و معشوق کا یکجائی فوٹو پیش کرے گا، فوٹو گرافر کے رخصت ہونے کے بعد مرزا صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی ارشاد کی :-

تم گر فلکِ حسن پہ ہو ماہ منیر | سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اسکا | بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

---

۱۷ مئی ۱۹۰۲ء

آج مرزا صاحب نے بتایا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے ان پر کیا کیا نوازشات فرمائیں، سب سے پہلے ساڑھے چار سو روپیہ کا منصب عطا فرمایا، اس کے بعد ساڑھے پانچسو کا اس میں اضافہ فرمایا، دربار میں کھڑے رہنے کی بجائے بیٹھنے کی اجازت عطا ہوئی، سیر و شکار اور دوسرے دوروں اور تفریحوں میں ساتھ رہنے کا اعزاز بخشا، تمام انگریزی درباروں میں شرکت کی اجازت دی گئی، خاص سفر میں بھی ہمرکاب رہنے کا حکم ہوا، علاوہ ان باتوں کے مختلف نوازشات بھی وقتاً فوقتاً ہوئیں، مثلاً ایک گھڑی مرصع الماس یاقوت کی عطا ہوئی جس کی قیمت ۲۰ ہزار ہے، ایک نقرئی گھڑی مرصع

۵ منی بائی حجاب کے ہونٹ پر تل تھا۔

یاقوت مع ایک توڑے اشرفیوں کے عطا ہوئی ایک گھڑی قیمتی ایک ہزار دی گئی گھڑیوں کی تین عدد طلائی چینیں عطا ہوئیں، تلواریں، چوب دستیاں وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً مرحمت ہوئیں، بطور جاگیر ایک قطعہ آراضی مع باغ جو حیدرآباد سے جانب مشرق ۱۰ کوس کے فاصلے پر ہے عطا ہوا، الغرض شاہی الطاف واکرام سے مرزا صاحب اس قدر مالا مال ہیں کہ دن عید اور رات شب برات ہے۔

۳۰/ مئی ۱۹۰۲ء

آج شام کو مرزا صاحب فرمانے لگے کہ کچھ سنا، نکاح کا تقاضہ ہو رہا ہے، عدت[1] کے دن پورے ہو چکے ہیں، میں بھی تیار ہوں، اس کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

برائے نام نکالے فلک مرے ارماں
جو ہے نکلنے کی حسرت کہاں نکلتی ہو

پھر فرمایا بڈھے ہو گئے، منہ میں دانت نہیں، نکاح کا ماحصل اور جزو اعظم دونوں کے پاس ندارد ؎

وقت آخر ہوا مگر اے داغ
ہوس زندگی نہیں جاتی

---

[1] یہاں لفظ "عدت" مرزا صاحب نے یقیناً ازراہِ مزاح استعمال فرمایا ہے ورنہ عدت شرعی کے دن حجاب یقیناً کلکتہ ہی میں گزار کر تشریف لائی ہوں گی۔

۳۱ مئی ۱۹۰۲ء

پنجۂ فولاد کے نام سے مرزا صاحب کے ایک شاگرد محمد الدین فوق نے لاہور سے ایک اخبار نکالا ہے، اڈیٹر صاحب نے اخبار بھیجا ہے اور اس کی تاریخ کی فرمائش کی ہے، مرزا صاحب نے آج اس کی تاریخ کہہ کر روانہ فرمائی اور فوق صاحب کو لکھوایا کہ :۔

"معلوم نہیں کس مناسبت سے اس اخبار کا نام آپ نے پنجۂ فولاد رکھا ہے گزشتہ محرم میں مجھے سلام کرنے ایک طوائف آئی تھی نام پوچھا تو کہا: بی فولاد جان کہتے ہیں، میں نے پوچھا تم میں کیا جوہر ہیں، اس نے مرثیہ کے چند بند سنائے میں نے اسے رخصت کر دیا، لیکن آج معلوم ہوا کہ "پنجۂ فولاد" فولاد جان کا نر ہے۔

بی حجاب کو مرزا صاحب جو سو روپیہ ماہوار دیتے ہیں ان میں ان کی مشکل سے گزر ہوتی ہے اور وہ آئے دن مرزا صاحب سے طلب کرتی رہتی ہیں اور مرزا صاحب حتی المقدور ان کی ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں لیکن آئے دن کی ان باتوں سے مرزا صاحب کو تکلیف ہونے لگی ہے، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دونوں کے دل میں فرق پیدا ہو گیا اور بی حجاب کرایہ والے مکان میں اٹھ گئیں، آج دوپہر کو میں حاضر ہوا تو مرزا صاحب متفکر سے بیٹھے ہوئے تھے، میں نے پوچھا تو بولے کہ ہم نے حجاب کو دل لگی کے

لئے بلایا تھا اور یہ سب اخراجات صرف اپنا دل بہلانے کے لئے برداشت کئے ہیں لیکن اب حجاب کی بعض باتیں سوہان روح ہوتی جاتی ہیں یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہے پھر مجھ سے بولے، ایک رقعہ تو لکھو، مرزا صاحب نے نواب حسین علی خاں کے نام یہ رقعہ لکھوایا :-

"نواب صاحب! حجاب کے گھر آپ گئے، کیفیت معلوم ہوئی۔ ان کی گزر یوں تو سو روپیہ ماہوار میں بھی نہ ہوگی جب وہ میرے مکان میں تھیں تو گیارہ مہینے بتاتی تھیں۔ مکان دار کو معرفت عبدالحمید کے بلا کر دریافت کرو کہ تمہارا کیا لینا ہے، از روئے کاغذ بتاؤ اور نصف کرایہ پر فیصلہ کرتے ہو۔ اگر لینا ہو تو اس سے زیادہ یہاں سے نہیں ملیں گے۔ اس کا جواب لے کر مجھے لکھئے۔"

۱ر جون ۱۹۰۲ء

اس روزنامچہ میں جگہ بہ جگہ مرزا صاحب کی زندگی کے واقعات حسن و عشق اور عالم محبت و وارفتگی کے ایسے اذکار ہیں کہ جنہیں پڑھ کر شاید لوگ ان کے اظہار و اعادے پر معترض ہوں، ہمارے پاس اس کا جواب بجز اس کے دوسرا نہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور کون درخت ہے جسکو ہوا ہی نہ لگی ہو۔ مرزا صاحب کی زندگی شروع سے رنگین ماحول میں گزری سو ما حول کا رنگ ان کی طبیعت نے بہت گہرا قبول کیا، ان کی حسن پرستی و شاہد نوازی کا

سرحد جنون تک پہنچی ہوئی ہے، ایسی طوائفوں کی فہرست بہت لمبی ہے جن کی صحبت سے مرزا صاحب فیض یاب ہوئے، ان خوش نصیب عورتوں میں کچھ ایسی ہیں جن کو ہم نے خود دیکھا ہے اور اس روزنامچے میں جگہ بجگہ ان کی دلفریب صورت، موہنی مورت اور دیگر عادات و اطوار کا حسب موقع ذکر کیا ہے اور ان کے قد و قامت، لب و لہجہ اور ان واردات کا جو مرزا صاحب کی زبان یا ان کے کسی ہمراز سے سنے، من و عن ذکر کر دیا ہے اور اس طرح مرزا صاحب کی زندگی کے اس نشاط انگیز رخ کو کسی حد تک بے نقاب کر دیا ہے جو بجز چند مخصوص احباب و تلامذہ کے دوسروں کو نہیں معلوم، اس کتاب میں ہر نوع کی یادداشتیں لکھ دی گئی ہیں، تاکہ مرزا صاحب کی زندگی پر ایک مستقل و مستند کتاب کے لکھنے میں ان یادداشتوں سے پوری پوری مدد لی جاسکے۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب نواب صاحب رامپور نے حج بیت اللہ کے جانے کا خیال ظاہر کیا اور مجھے ہمرکاب ہونے کا حکم ملا تو مجھے عجیب قسم کی خوشی ہوئی، شب و روز اسی کے اذکار تھے اور یہی فکر تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ سفر شروع ہو۔ لیکن جو وقت معین ہو چکا تھا اس سے پہلے یہ سفر کیونکر ممکن ہوتا، اکثر احباب مجھے سعادت حج نصیب ہونے کی مبارکباد دینے لگے، میں ان سے کہتا تھا کہ بھائی پہلے یہ سعادت نصیب تو ہو لینے دو زندگی کا کوئی پل ٹھیک نہیں خدا معلوم اس پاک بنیاد سرزمین تک پہونچ

بھی سکون لگا یا نہیں، مرزا صاحب کہتے ہیں کہ مجھ جیسے آزاد منش انسان کو حج بیت اللہ کی اتنی خوشی تھی کہ رات دن اسی سفر کے خیال میں مگن رہتا تھا، میرے اکثر اشعار میری اس کیفیت پر گواہ ہیں، یہ فرما کر مرزا صاحب نے بڑے پر کیف انداز سے اپنا ایک مقطع پڑھا ؎

یہ سنا جو حضرت داغ نے کہ حضور کعبہ کو جائیں گے
یہی ذکر ہے یہی فکر ہے شب و روز عزمِ سفر سے خوش

۲ر جون ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب کی حیات میں کئی دفعہ ان کے انتقال کی بے بنیاد خبر اڑ گئی، آج مرزا صاحب کے ایک شاگرد نے خود مرزا صاحب سے خط لکھ کر اس قسم کی غلط خبروں کی وجہ معلوم کرنا چاہی، مرزا صاحب نے ان کو یہ جواب لکھوایا:-

عمر کے دن گزرتے جاتے ہیں
جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں

حکیم صاحب مسیحائے زماں سلمہُ الرحمٰن، سلام مسنون کے بعد دعا نگار ہوں کہ آپ کا کارڈ پہنچا، آپ نے میرے انتقال کی خبر سنی، میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے تو ایک دفعہ میرے مرنے کی خبر سنی میں ہر سال سنتا ہوں اور اسی کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ جن رئیس نے میرے زندہ ہونے کی تصدیق کی تھی وہ بے چارے خود چل بسے خدا ان کو جنت نصیب کرے اور مجھے بھی اور آپ کو بھی، میں آپ کا ممنون ہوا کہ اس دلسوزی سے داغ کو یاد فرمایا

عمر دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

۳/ جون ۱۹۰۲ء

آج دو روز سے مرزا صاحب بہت سست اور بجھے بجھے نظر آتے ہیں، وہ شگفتگی و خنداں پیشانی مفقود ہے جو مرزا صاحب کی فطرت ثانیہ ہے، وجہ افسردگی اس کے سوا دوسری نہیں کہ بی حجاب سے کچھ ان بن ہو گئی ہے، کئی روز سے حجاب مرزا صاحب کے یہاں ہی ہیں اور بعض معاملات کی صفائی کرنے کے لئے آئی ہوئی ہیں، مرزا صاحب اور حجاب کے درمیان کچھ ایسی غلط فہمیاں حائل ہو گئی ہیں کہ ان کا اب دور ہونا مشکل نظر آتا ہے، آج کل مرزا صاحب کا زیادہ وقت باہر گزر رہا ہے دوپہر کا کھانا بھی آج باہر ہی کھایا، شام کو بی حجاب نے اندر بلوایا تو ایک کاغذ کے پرزے پر یہ شعر لکھوا کر بھجوا دیا ؎

در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں یہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

مرزا صاحب کی عمر اب ایسی نہیں کہ وہ عاشقانہ غمزوں اور نخروں کے متحمل ہو سکیں یہ تو سب جوانی دیوانی کے کرشمے ہوتے ہیں کہ انسان بڑی کڑی کڑی جھیل جاتا ہے، بی حجاب باوجودیکہ خود بھی اب عمرِ رفتہ کی یادگار رہ گئی ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہے، ناز و غمزے سے مطلق پہلو تہی نہیں فرماتیں، اپنی اور مرزا صاحب کی عمر کا لحاظ کر کے ان کو اب ان غمزوں سے گریز کرنا چاہیئے بلکہ برخلاف اس کے آئے دن وہ تکرار رنجی کا کوئی نہ کوئی پہلو اختیار کر لیتی ہیں، جس کا اثر مرزا صاحب پر کئی کئی دن رہتا ہے

آج شب کو مرزا صاحب کے پاس ہم اور حسن علی خاں موجود تھے کہ مرزا خورشید عالم اور سراج الدین خاں سائل پہونچے، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد میر حسن علیخاں میرٹھی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ بی حجاب کے معاملہ میں آپ نے کیا سوچا ہے، مرزا صاحب حسن علی خاں کے اس سوال پر چونک پڑے، پوچھا آپ کا یہ دریافت کرنے سے کیا مطلب ہے حسن علی صاحب نے جواب دیا کہ آجکل آپ جس الجھن اور فکر میں گرفتار ہیں اس کی وجہ بجز حجاب کے معاملات کے اور کوئی نہیں، اگر آپ کا ارادہ درحقیقت ان سے نکاح کرنے کا ہے، بسم اللہ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیئے اور اگر ایسا خیال نہیں ہے تو پھر یہ روز و شب کی چقلپش نہ صرف آپ کے لئے سوہانِ روح ہے بلکہ اس سے آپ کے عزیز دوستک

کو فکر لاحق ہے اور دوسری طرف ہم آپ کے مخلصوں کو بھی ایک خلش سی رہتی ہے کہ ایک مرنجان مرنج اور ہنستا بولتا انسان کچھ روز سے خاموش اور بجھا بجھا سا رہتا ہے، مرزا صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب آپ لوگوں کو میری پریشان خاطری سے جو تکلیف ہے اس کا مجھے احساس ہے اور میں آپ کے خلوص کی دل سے قدر کرتا ہوں، رہا سوال عزیزوں کا، ظاہر ہے کہ میری موجودہ حالت سے ان کو فکر نہ ہوگی تو پھر کس کو ہوگی داغ کی زندگی جن عیش پسندیوں میں گزرتی رہی ہے اور داغ کا پیسہ جس بے دردی سے ان فضول ضروریات پر صرف ہوتا رہا ہے اس پر تو آج تک میرے کسی عزیز کو افسوس نہ ہوا لیکن آج جب میں ایک نیک کام کی طرف راغب ہوں تو لوگ فکرمند ہیں، نواب صاحب میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں، میں دوست کی دوستداری اور عزیزوں کی عزیزداری کے اتار چڑھاؤ خوب سمجھتا ہوں، بہرحال میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ اپنی جگہ اٹل ہے، اور اس باب میں میرے کسی عزیز کو میری فکر نہیں کرنی چاہیے۔

مرزا صاحب کی گفتگو کے اس انداز کو دیکھ کر سب خاموش ہو گئے میر حسن علی خاں نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا، سراج الدین خاں سائل اور مرزا خورشید عالم دس بیس منٹ اور بیٹھے اس کے بعد سلام کر کے رخصت ہو گئے، ان کے اٹھ جانے کے بعد میر حسن علی خاں نے پھر سوال کیا کہ مرزا صاحب میں نہایت ادب سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ

آپ نے بی حجاب سے نکاح کر لینے کا جو فیصلہ کیا ہے کیا اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی ؟ ، مرزا صاحب مسکرا کر بولے کہ میں عرض ہی کر چکا کہ میں اٹل فیصلہ کر چکا ہوں ، حسن علی نے مرزا صاحب کو بتایا کہ آپ کے قریب قریب تمام عزیز آپ کے اس خیال کے خلاف ہیں وہ نہیں چاہتے کہ بی حجاب سے نکاح کیا جائے ، جہاں تک مجھے معلوم ہے لاڈلی بیگم خود بھی اس کی سخت مخالف ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ادب و لحاظ کی وجہ سے کچھ نہ کہیں بہر حال آج مرزا خورشید عالم اور سراج الدین کا میں ایسے موقع پر یہاں آنا اسی لئے تھا کہ آپ سے کھل کر بات کی جائے مگر آپ کے اٹل فیصلے نے ان کو خاموش ہی رہنے دیا . میری فرداً فرداً آپ کے تمام عزیزوں سے بات چیت ہو چکی ہے اور مجھے آئندہ کسی سخت فساد کا پورا پورا اندیشہ ہے یہ سب سن کر مرزا صاحب بولے کہ ہاں یہ سب صحیح ہے اور مجھے بھی سب کچھ معلوم ہے اور انہیں سب باتوں کے پیش نظر میں نے یہ اٹل فیصلہ کیا ہے مرزا صاحب کے اس ارشاد پر حسن علی خاں مایوس ہو کر خاموش ہو گئے کچھ دیر طرفین میں خاموشی رہی اسکے بعد مرزا صاحب نے یکایک ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ میرے بھولے نواب اتنی دیر سے بات چیت کر رہے ہو لیکن تم نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں نے کیا اٹل فیصلہ کیا ہے ، حسن علیخاں مرزا صاحب کے اس ارشاد پر بھی خاموش ہی رہے ، مرزا صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب میرا اٹل فیصلہ یہ ہے کہ " بی حجاب سے کبھی نکاح نہ کیا جائے " ، آپ داغ کو آج تک نہیں سمجھ سکے . داغ نے اپنی تمام عمر

اس خرافات میں بسر کر کے بہت کچھ سیکھا ہے اور بڑے بڑے سبق حاصل کیے ہیں، اگر میں حجاب سے نکاح کرتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا، آپ کو معلوم ہے کہ مجھ پر حجاب کی طرف سے کتنا زور ڈالا جا رہا ہے اور ہم دونوں کے درمیان اگر کوئی چیز مخالفت کی وجہ اس وقت بنی ہوئی ہے تو وہ یہی نکاح کا مسئلہ ہے، وہ مصر ہیں اور میں مکلف بلکہ منکر، اور اس قطعی فیصلے سے مجھے کوئی منحرف نہیں کر سکتا، لیکن چاہتا ہوں کہ میرے اعزا کو بھی معلوم رہے کہ میں حجاب کے ساتھ نکاح کرنے پر قطعی مستعد ہوں، گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ جلیل حسن جلیل اور اختر آگئے اور ان سے علیک سلیک کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

٭٭٭٭٭٭

۶ر جون ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب نے آج دہلی کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ ایک جلسے میں وہ پہنچے جہاں ایک صاحب بہادر بھی تشریف فرما تھے، مرزا صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا، طبیعت میں چھیڑ بھری ہوئی تھی، اس انگریز نے مرزا صاحب سے ہاتھ ملایا اور یہ سمجھ کر کہ یہ بھی انگریزی جانتے ہونگے انگریزی میں کچھ پوچھا، مرزا صاحب نے برجستہ اسی لب و لہجہ میں جواب دیا، صاحب بہادر یہ انداز سخن دیکھ کر بہت متعجب ہوئے اور اردو زبان میں پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، مرزا صاحب نے فرمایا کہ میں امریکہ کا باشندہ ہوں، مرزا صاحب کے اس فرمانے پر وہ انگریز

ان کے رنگ و روپ پر غور کرنے لگا، مرزا صاحب یہ دیکھ کر بولے کہ آپ میری روسیاہی پر نہ جائیے میں نے سمندری سفر بہت کیا ہے یہ رنگ دھوپ، سمندر کی آب و ہوا نیز جہاز کے دھوئیں نے سیاہ کر دیا ہے، مرزا صاحب کے اس جملے پر جلسے میں ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا اور صاحب بہادر بھی ہنس دیئے۔

۴ر جون ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب کو دردِ نقرس کا آج بہت شدید دورہ پڑا، درد کی تکلیف کی وجہ سے انہیں بخار بھی آگیا دوپہر کے بعد ہذیانی کیفیت شروع ہو گئی فوری دوڑ دھوپ سے یہ کیفیت تو شام تک دور ہو گئی لیکن درد میں کمی نہیں ہوئی بعض دفعہ تو جلن اور ٹیس کی تکلیف سے مرزا صاحب کراہنے لگتے تھے، سہ پہر کو منی بائی حجاب کا آدمی کیفیت مزاج پوچھنے آیا مرزا صاحب کو جب معلوم ہوا تو بولے کہ حجاب سے شکریہ ادا کر دینا اور کہہ دینا کہ میری تکلیف میں اس طرح کے تکلفات فرما کر وہ اضافہ کر دیا کرتی ہیں میں جس حال میں ہوں خوش ہوں ذرا طبیعت ٹھیک ہو جائے تو دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کروں گا کہ کئی روز کی خاموشی کے بعد انہوں نے یاد تو کیا، پوچھا تو کہ داغ زندہ ہے یا نہیں، بہر حال اسے کہہ دینا سہ

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

منی بائی کا آدمی جب واپس چلا گیا تو بولے کہ اس روز آئی تھیں صفائی کرنا چاہتی تھیں، صفائی کی بجائے دلوں میں اور کدورت پیدا ہو گئی ناراض ہو کر چلی گئیں تو آج ہوش آیا ہے، مغرب کے بعد بی حجاب کا آدمی پھر آیا، اور ایک خط مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا مرزا صاحب نے خط خود کھولا، پڑھا اور ہنسکر مجھے دیدیا، آدمی سے فرمایا کہ کہدینا کہ اب بہتر ہوں، رات ہو گئی ہے اس وقت تکلیف کرکے کیا کریں گی اگر صبح تک زندہ رہوں تو آن کر دیکھ لیں یہ کہہ کر درد کی تکلیف کی بنا پر آنکھیں بند کر لیں، بی حجاب کا آدمی سلام کرکے واپس ہو گیا، بی حجاب نے رقعہ میں یہ لکھا تھا:۔

مکرمنا، سلام شوق، آپ کی شکایت درست ہے لیکن دل پر جبر کر لینا بڑی مشکل بات ہے، جمال نے آپ کے یکایک علیل ہو جانے کی خبر سنائی تو دل نہ مانا، سوچتی رہی کہ خود جاؤں یا پہلے کیفیت مزاج کی دریافت کرالوں، جمال صاحب کبھی کبھی ایسی باتیں مذاق میں بھی فرمادیا کرتے ہیں، محض تصدیق کے لئے آدمی بھیجا تو آپ کو واقعی علیل سنا، آپ نے جو کچھ کہلوایا کیا آپ سے مجھے اسی کی امید رکھنا چاہیئے اتنا سوچئے کہ میں اپنے وطن سے اتنی دور محض آپ کی خاطر سے پڑی ہوں، آپ ہی کے لئے میں نے اپنا گھر چھوڑا، آپ ہی جب میرے دل پر چوکے لگائیں گے تو میرا کہاں ٹھکانا ہے

آپ کھل کر اجازت بھی تو نہیں دیتے۔ میں ایسے حالات میں یہاں
رہنا کیسے پسند کروں، آپ خیال کرتے ہیں کہ میں آپ سے
کھنچی کھنچی رہتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ کے دل میں
میری جگہ نہیں رہی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے آپ کا
منشا ہو تو مزاج پرسی کے لئے حاضری کی اجازت دیجئے۔ میں
نے دیکھا ہے کہ میرے آنے سے آپ کچھ خوش نہیں ہوتے
اسی لئے اجازت طلبی کی ضرورت ہوئی، آپ کے عزیز بھی ہمارے
میل ملاپ کے مانع ہیں، زیادہ نیاز

راقمہ

حجاب

واقعہ دراصل یہ ہے کہ بعض حالات نے مرزا صاحب اور بی حجاب کے
کے دلوں کو کدورتوں سے بھر دیا ہے۔ حجاب اس خیال سے حیدرآباد
آئی تھیں کہ آخر عمر آچلی مرزا صاحب کے ساتھ اچھی گزر جائیگی مرزا صاحب
جو ازلی حسن پرست واقع ہوئے ہیں شروع میں واقعی اس ارادے
میں تھے کہ نکاح ہو جائے تو مناسب ہے لیکن اپنے گھر کے حالات
سے کچھ ایسے مجبور ہوئے کہ انہیں یہ ارادہ ترک کرنا پڑا، انکے بعض
اعزہ نے اپنے آئندہ اندیشوں کی بنا پر ایسی ریشہ دوانیاں شروع کیں
اور وہ ایسی حرکات کے مرتکب ہوئے کہ وہی منی بائی حجاب جو کبھی فریاد داغ
کی تخلیق کا باعث تھیں اور سالہا سال کی جدائی اور فراق بھی جن کی

محبت اور جھنگے سوزِ عشق کو ٹھنڈا نہ کر سکا آج مرزا صاحب کی نگاہوں سے گر چکی تھیں اس کی وجہ زیادہ تر حجاب کے وہ نواحقین تھے جو کلکتے سے حیدر آباد آگئے تھے اور بی حجاب سے لگے لپٹے رہا کرتے تھے، مرزا صاحب کو طبعاً ان سے بے تعلقی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر مرزا صاحب کے اعزہ کو ادھر بی حجاب کے نواحقین کو موقع مل گیا اور دونوں طرف غلط فہمیاں پیدا کرنے لگے، جس کے نتیجے میں آج مرزا صاحب اور بی حجاب کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔

تقریباً آٹھ بجے منی بائی حجاب مرزا صاحب کے مکان پر پہونچیں، مرزا صاحب کو اطلاع ہوئی، حاضر باشوں نے تخلیہ کی ضرورت محسوس کی اور ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے میں نے اور حسن علی خاں نے بھی اٹھنا چاہا، مرزا صاحب بولے تو کیا آپ سب مجھے تنہا چھوڑ دیں گے، آپ دونوں تو کم از کم بیٹھئے، ہم لوگ بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد منی بائی حجاب پہونچیں، مرزا صاحب درد کی تکلیف میں آہستہ آہستہ کراہ رہے تھے، بی حجاب نے سلام کیا، مرزا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا، بی حجاب کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے وہ مرزا صاحب کے پائیں جا بیٹھیں، حسن علی خاں اور ہم دونوں بیک وقت اپنی جگہوں سے اٹھے اور دوبارہ رخصت ہونے کی اجازت چاہی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ آخر آپ لوگوں پر یہ کیا وحشت سوار ہے بار بار کھڑے ہو جاتے ہیں، حسن علی خاں بولے حضرت مجھے ایک ضروری کام ہے، مرزا صاحب

نے کہا اچھا کھانا کھا لیجئے، پھر چلے جایئے یہ حجاب بھی آگئی ہیں میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ ان کے ساتھ کھانا کھا سکوں، آپ ہی ان کے ساتھ کھانا کھا لیجئے، حجاب بولیں کہ میں کھانا کھا کر آئی ہوں، حسن علی خاں نے کہا اور مجھے کھانا آج ایک جگہ دعوت میں کھانا ہے بہتر ہے کہ اس وقت اجازت ہی دی جائے، حجاب کو اس وقت روک لیجئے کل تک انشاء اللہ آپ کی طبیعت ضرور ٹھیک ہو جائے گی، پھر سب مل کر کھائیں گے۔ مرزا صاحب خاموش ہو گئے اور ہم دونوں سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

۱۰ رجون سنہ ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب کو تنہائی سے بڑی وحشت ہوتی ہے، شعر کہتے وقت دنیا تنہائی چاہتی ہے لیکن مرزا صاحب کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میرے گرد اگر لوگ نہ ہوں تو میں شعر نہیں کہہ سکتا، میرے پاس جب لوگ نہیں ہوتے تو گھبرا اٹھتا ہوں، دل چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جاؤں، بھائی میں قبر میں بھی تنہا نہیں رہ سکتا اول تو کسی کو ساتھ لیتا جاؤں گا، اگر کوئی راضی نہ ہوا تو کسی کی تصویر ہی ساتھ لیتا جاؤں گا، اگر تصویر بھی نہ لے جا سکا تو جب فرشتے سوال و جواب کرنے آویں گے تو ان میں سے کسی ایک کو پکڑ لوں گا، بہر حال قبر میں بھی تنہا نہ رہوں گا۔

مرزا صاحب کی تنہائی کے نفرت کے ثبوت میں غالباً اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مرزا صاحب اکثر و بیشتر پاخانے میں بیٹھے ہوئے باتیں کیا کرتے ہیں، میں نے خود بارہا انہیں پاخانے میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے سنا ہے اور ان کی اس عادت پر حیرت کی ہے۔

۱۵ رجون ۱۹۰۲ء

آج کی صحبت میں مرزا صاحب نے اپنی اہلیہ کا ذکر کیا اور دیر تک ان کی محبت، اطاعت اور خلوص کے واقعات بیان کرتے رہے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے دل میں اپنی بیوی کا بڑا احترام تھا، انہوں نے بتایا کہ میری بیوی کا یہ طریقہ تھا کہ ہر سال عید و بقرعید کے موقعوں پر وہ سرو قد کھڑی ہو کر تعظیم دیا کرتی تھیں،

مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک روز وہ بہت سخت بیمار تھیں اور زیست کی امید نہیں رہی تھی میں نے اپنے جرموں اور بے اعتدالیوں کا عفو چاہا اسی وقت کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے اور تمام لوگ بھی انکے گرد جمع ہو کر اپنا اپنا کہا سنا معاف کرا رہے ہیں، مرحومہ سب کو معاف کر رہی ہیں، میرا دل بھر آیا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، میں نے نہایت منت و سماجت سے اور پوری مجبوری کے عالم میں ان سے کہا کہ میری بھی خطا معاف کر دو، بی بی نے کہا کہ میں تمہاری خطائیں کبھی نہیں

معاف کرونگی ۔ مرزا صاحب نے دوبارہ التجا کی پھر بھی یہی جواب ملا ۔ مرزا صاحب نے کہا پھر تو میں بھی تم کو کبھی معاف نہیں کرونگا ۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلدیا جمعرات کے روز ان کا انتقال ہوا تو مجھے بلایا اور فرمایا کہ اس روز میں تمہیں آزماتی تھی تم ایسے خفا ہوئے کہ پھر آئے بھی نہیں ۔ اچھا تو اب میں تمہیں معاف کرتی ہوں ، تم بھی مجھے معاف کردو ۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ بی بی نے مجھ سے سوال کیا کہ تم میرے بعد نکاح تو نہیں کروگے مرزا صاحب نے پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ، انہوں نے فرمایا کہ صرف اتنا کہ اگر کروگے تو بہشت میں تمہارے ساتھ میری سوکن بھی ہوگی اور ایسی بہشت میں میرا گزر ہرگز نہ ہوگا ، ایسی بہشت تم ہی کو مبارک رہے ۔

مولانا احسن مارہروی کا لکھا ہوا یہ روزنامچہ ۱۵ ؍ جون کو ختم ہو جاتا ہے ، اس کے بعد وہ غالباً کچھ نہ لکھ سکے ، وہ جون کے اواخر میں وطن واپس چلے آئے اس کے بعد چشم دید حالات لکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا ۔ لیکن وہ وطن آجانے کے بعد بھی استاد اور استاد کے حالات سے بے تعلق نہیں رہے ، وہاں کے باقی ماندہ حاضر باشوں سے برابر ان کی خط وکتابت رہی اور وہ ان سے استاد کے حالات معلوم کرتے رہے اس سلسلے میں بہت سے خطوط میرے پاس موجود ہیں جن کو ترتیب وار یہاں درج کر کے ۱۵ ؍ جون ۱۹۰۵ء کے بعد کے حالات بھی کسی نہ کسی حد تک ظاہر کئے جا سکتے ہیں اور اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن

معاشی پابندیوں کے پیش نظر یہ کام بحالات موجودہ اگر مشکل نہیں تو طول عمل کے مصداق ضرور ہے لہذا اسے آئندہ امکانات کے حوالے کرکے صرف دو تین ایسے خط پیش کرتا ہوں جو مرزا داغ کی بیماری اور وفات نیز بعض قریب ترین اعزا کے طرز عمل کے اظہار واشتہار پر مشتمل ہیں، یہ خط داغ کے ایک مخلص ترین شاگرد نواب میر حسن علیخاں آمیر نے مولانا احسن مارہروی کو لکھے تھے، ان خطوط کے پڑھنے کے بعد جہاں آپ ہندوستان کے ایک بڑے شاعر کی غمگین موت کے مشرح حالات معلوم کر سکیں گے وہیں بزم داغ کے ایک ضروری اور آخری باب کا تکملہ بھی ہو جائے گا۔ خط ملاحظہ ہوں :۔

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ

بھائی صاحب مشفق مہربان کرم فرمائے مخلصان سلمہ اللہ الرحمٰن

سلام شوق و آرزوئے ملاقات کے بعد مدعانگار ہوں، ابھی آپ کا پرچہ فصیح الملک پہنچا، آپ نے مجھ سے کچھ حالات استاد مرحوم کے دریافت کئے تھے، میں بچہ کی شادی کے کاروبار میں مصروف تھا فرصت نہ ہوئی معافی چاہتا ہوں، دو چار روز پیشتر صاحب عالم تشریف لائے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ احسن صاحب بھائی صاحب کی وفات کے زمانے کے حالات مانگتے ہیں اور تاریخ۔ بھائی صاحب! استاد مرحوم کے ایام مرض کے پورے پورے حالات نہ صاحب عالم کو معلوم نہ مرزا سراج الدین خاں کو۔ صاحب عالم تو رات میں ایک دفعہ اور دن میں ایک وقت استاد مرحوم کے پاس آکر دو چار منٹ باتیں

کر جاتے تھے مگر مرزا سراج الدین بہادر نے آغاز بیماری سے روزِ انتقال تک مڑ کر بھی اس طرف نہ دیکھا اور نہ ناصر نے دیکھا اور مرزا سراج الدین خاں آپ ہی مرضِ اختلاج میں مبتلا ہو گئے، جو کوئی ان سے بیمار کے پاس جانے کو کہتا تھا، وہ یہ جواب دیتے تھے کہ بیمار کو حالت مرض میں مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، البتہ روز تفریح کے لئے حیدرآباد کلب میں اور منشی محمود علی صاحب کے مکان پر چوسر و گنجفہ وغیرہ کھیلنے جایا کرتے تھے، ناصر بائیسکل پر بیٹھ کر اپنے یاروں میں سرگرداں، حالتِ مرض میں روزانہ استاد مرحوم نے مرزا سراج الدین خاں اور ناصر کو بارہا یاد کیا اور کہا کہ کیا گھر میں نہیں ہیں، موجودہ لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ گھر میں نہیں ہیں، بھائی میں نے اس قسم کے لوگ سنگدل آج تک نہیں دیکھے ادھر صاحب عالم اپنے مزے میں مبتلا، خدمت گاروں نے اور عبدالغنی خاں نے بیمارداری اور نگرانی کی بیمار ہونے کے حالات سنئے ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ کو انہیں نزلے کی تحریک ہوئی پائیں صحن جا بیٹھے دفعتاً زبان میں لکنت ہوئی۔ وہاں سے اٹھے عبدالغنی کو بلایا اور یہ کہا کہ ایک بات میرے منہ سے لکنت کے ساتھ نکلی اب اس کا کچھ اثر نہیں ہے، پھر مجھ سے باتیں ہوتی رہیں، میں نے گھر جانے کو کہا تو مجھ سے کہنے لگے کہ کھانا کھا کر جاؤ میں بیٹھا رہا۔ ۸ بجے حسب عادت نہ کھانا کھایا، میرے لئے گاڑی کا

حکم دیا میں سوار ہو کر چلدیا۔ ۳۰ ذی قعدہ کو میں پانچ بجے گیا، استاد تخت پر نہایت عمدہ کوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور روبرو منشی لطیف احمد صاحب اور حافظ جلیل حسن صاحب بھی ہیں، میں جب قریب پہنچا تو میرے لئے استاد مرحوم اٹھ کھڑے ہوئے، سلام کر کے میں پاس ان کے بیٹھ گیا، اتنے میں ولی عہد بہادر کا لفافے کر سوار آیا اس کو دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ یہ چوتھا لفافہ ہے، لفافہ مجھے دیا میں نے اسے کھولا مضمون سنا دیا، کسی محاورے کے باب میں ولی عہد نے یہ لکھا تھا کہ میرا پہلا لفافہ بھیجدیجئے تاکہ میں اپنے لفظ دیکھوں، مجھ سے فرمایا کہ وہ لفافہ ڈبکس میں سے نکالو ہر چند تلاش کیا مگر وہ لفافہ نہ ملا، اُس وقت دوات قلم کاغذ طلب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے لکھنا شروع کیا جب دو چار سطریں انہوں نے لکھیں لطیف میاں نے کہا حضرت آپ کیا کر رہے ہیں کاغذ پر جو آپ نے لکھا ہے کوئی حرف معلوم نہیں ہوتا، استاد نے انہیں جواب دیا کہ بھائی میرا دماغ نزلے سے بند ہے، کیا کروں پھر مجھ سے کہا کہ میاں تم لکھو، وہ کہتے تھے میں لکھتا تھا، لفافہ بند کر کے سوار کو دیا اور خط میں ولی عہد کو نزلے کا حال لکھا، قبل مغرب حافظ صاحب اور لطیف میاں رخصت ہوئے، استاد نے عبدالغنی کو یاد کیا اور ان سے کہا کہ لعاب بہدانہ، لعاب گاؤزبان تیار کرو مجھ سے کہا اندر چلو، آٹھ بجے شب کو میں نے رخصت ہونا چاہا تو

کہا کھانا کھا کر جائیے اسی وقت کھانا مانگا، کھانا آیا تو کہا مجھے بھوک نہیں آپ کھا لیجیے۔ میں نے عبدالغنی کو ساتھ لے کر کھانا کھایا، استاد لطیف جان سے ہنستے رہے دس بجے۔ میں وہاں سے چل دیا، میں کچھ اپنی حالت اس جگہ عرض کرتا ہوں استاد کو چھوڑ کر جانے کا یہ سبب تھا کہ میرا نواسہ (اس زمانے میں بخار سے سخت علیل ہو گیا تھا، استاد خود روز آ کر دیکھتے تھے! اس سبب سے وہ آپ ہی مجھے رخصت کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر میں نے اپنا مکان چھوڑ دیا تھا ملک بیٹھ میں ایک کوٹھی سو روپیہ کرایہ پر لیکر ٹھہرا ہوا تھا، زنانہ مردانہ سب وہیں تھا خیر صبح کو نو بجے میں پھر استاد کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ استاد بند کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ نواب مجھ پر فالج گرا اور آبدیدہ ہوئے، میں نے تسلی دی اور پوچھا کہ کیا گزرا تو استاد نے مجھ سے کہا کہ حسب عادت ۴ بجے اٹھ کر وضو کیا جب پیر دھویا زبان کو لکنت ہوئی اور ہاتھ کانپے جمال صاحب نے تو آں سے ہاتھ پیر کا پانی خشک کیا استاد نے نماز پڑھی، جمال صاحب کا بیان ہے کہ سجدہ کبھی کسی طرف کیا کبھی کسی طرف، نماز سے فارغ ہو کر شیخ محبوب سے کہا کہ حکیم نابینا صاحب کو جا کر لاؤ، حکیم صاحب نے گاڑی واپس کی اور چار گولیاں بھیجیں کہا جاتے ہی دو گولیاں کھلا دو بارہ بجے دو گولیاں، چار بجے گاڑی لاؤ میں آتا ہوں، اسی وقت

دو گولیاں کھلائی گئیں، دروازے کمرے کے بند کر دیئے اعلیٰحضرت کو بذریعہ عرضداشت اطلاع کی گئی، دس بجے ایک دست ہوا جس کا رنگ سیاہ اور نہایت بری بو کا تھا، اعلیٰ حضرت نے حکیم صاحب کو لکھ بھیجا کہ میرے استاد کا علاج دل لگا کر کیجئے اور وقتاً فوقتاً مجھے اطلاع ہو، حکیم صاحب ۱۰ بجے آئے مریض کو دیکھا اور اطمینان ظاہر کیا اور ہم سے کہا کہ حوائی قلب وغیرہ سب اچھے ہیں ذرا سی ہوا لگ گئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ دو روز میں اچھے ہو جائینگے دوا غذا میری رائے کے موافق ہو، پھر دست ہوئے ہوش و حواس سب ان کے درست تھے مگر تمام دن بےچینی زیادہ رہی شب میں کرب بہت رہا، ۲ ذی الحجہ کو حکیم صاحب نے مرغ اور جنگلی کبوتر کا شوربا دینے کا حکم دیا، استاد نے نزدیک اپنے مجھے بلا کر کہا کہ نواب میرا ایک ہاتھ ایک پیر نہیں اٹھتا، صاحب عالم سے بھی کہا ہاتھ پیر کی بیکاری پر روئے مگر اس میں حرکت پیدا نہ ہوئی، حکیم صاحب سے صبح میں نے کہا تو حکیم صاحب نے جواب دیا کہ دو روز میں کھل جائیں گے اس کا خوف نہ کیجئے دوسرے روز مدارالمہام صاحب بہادر نے ترکی صاحب کو عیادت کے لئے بھیجا، میں نے خود جا کر استاد سے کہا کہ مدارالمہام نے ترکی صاحب کو بھیجا ہے، اس وقت استاد چوکی پر تھے مجکو جواب دیا کہ ابھی بلواتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد سالار آیا

اور مجھ سے کہا کہ ترکی صاحب کو لے جایئے، میں ترکی صاحب کو لے گیا، استاد لیٹے ہوئے تھے، ترکی صاحب نے آداب عرض کی جواب سلام کا دیا، ترکی صاحب نے کہا کہ فصیح الملک بہادر لوگوں نے آپ کو میری جانب سے بدگمان کیا ہے اور جھوٹ کہا ہے میں آپ کا چالیس برس کا نیاز مند ہوں آپ نے تو میرے ساتھ نیکی کی ہے، اور یہ کہا کہ ایک بکری منگواؤ اور اس طرح اس کی قربانی کرو، پھر استاد نے آنکھیں بند کرلیں، ترکی صاحب بیٹھے رہے پھر ترکی صاحب نے مجھ سے کہا کہ سرکار نے جلدی آنے کو حکم دیا ہے میں نے کہا استاد کو اطلاع کرو اور پوچھو ترکی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ ہی پوچھ لیجئے میں نے استاد کو جگایا اور کہا کہ ترکی صاحب کو سرکار نے یہ حکم دیا ہے کہ جلدی آپ کی کیفیت علالت لائیں" تو استاد نے فرمایا دوات قلم کاغذ منگاؤ اور آپ کو سب حال معلوم ہے لکھدو، میں نے ابتدائے مرض سے اس وقت تک کا سب حال لکھا۔ پھر استاد سے کہا کہ لکھ چکا، دستخط کون کریگا، مجھ سے فرمایا کہ دستخط اپنے کرو، جب میں نے دستخط اپنے کرکے کہا کہ بند کردوں تو فرمایا یہ فقرہ لکھو اور بند کردو، وہ فقرہ استاد کی زبان کا یہ تھا" آپ نے ترکی صاحب کو میری عیادت کے لئے بھیجا میں نہایت ممنون ہوا، ترکی صاحب نے پھر عرض کی مدارالمہام صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ جس قسم کی مدد مجھ سے چاہتے ہیں، اس

کے پورا کرنے کو میں حاضر ہوں، استاد نے اس کا جواب یہ دیا کہ اعلیحضرت نے سب کچھ دیا ہے آپ سے کوئی ضرورت نہیں ہر روز تین چار سوار مدار المہام کے مزاج پرسی کے لئے آتے رہے پانچ چھ روز مزاج ایک حالت پر رہا، ساتویں تاریخ حکیم صاحب نے نبض وغیرہ دیکھ کر کہا کہ اب میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ اچھے ہو گئے، استاد نے حکیم صاحب سے کہا کہ گانا سننے کی اجازت دیجئے، حکیم صاحب نے کہا ضرور سنئے، استاد نے فرمایا کہ گناہ آپ کے سر پر، حالتِ مرض میں بھی استاد مرحوم ہر ایک سے ہنستے تھے خصوصاً لطیف جان سے، ساتویں تاریخ تمام دن مزاج اچھا رہا شب میں آٹھ بجے مرغ، کبوتر اور بٹیروں کا شوربا نیا کرایا گیا تھا، دو تولہ پھلکا اور شوربا اور ایک کوفہ خواہش کے ساتھ منگوا کر حسب رائے حکیم صاحب کھایا، پانچ تولے پانی پیا پھر کہا تھوڑا سا پانی اور دو، لطیف جان نے دو تولے پانی اور دیا، دانت منگوائے منہ میں لگائے، پان کھایا اور ہر ایک سے کہا خدا نے بچا لیا، گیارہ بجے رات کو میں سوار ہو کر ملک پیٹھ چلا آیا، تمام رات وہ اچھے رہے صبح سب سے بات کی حکیم صاحب کو رقعہ لکھوایا، صبح سے گونہ بخار تھا دس بجے دفعتاً بخار زیادہ ہوا بے ہوش ہو گئے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنا چاہتے تھے مگر کھلتی نہ تھیں، بارہ بجے تنفس ہو گیا، حکیم صاحب ۴ بجے آئے، دوا ایک ادویات ساتھ

لائے گئے، آدھے آدھے گھنٹہ کے فصل سے دیں تنفس اور بڑھ گیا حکیم صاحب نے کہا پیچھے بڑا تکیہ لگا کر بٹھاؤ ویسا ہی کیا گیا اس سے تنفس میں کچھ کمی ہوئی، سیدھا ہاتھ دم بدم اٹھاتے تھے، حکیم صاحب نے عبدالغنی سے پوچھا، دواء المسک ہے غنی نے کہا ہے، چھ ماشہ پانی میں گھول کر پلائی، آدھ گھنٹہ دیکھتے رہے پھر کہا چھ ماشہ اور اسی طرح پلاؤ پھر پلایا تھوڑی دیر کے بعد نبض بگڑی حکیم صاحب مریض کے پاس سے اٹھے باہر آئے، ہم اور صاحب عالم ان کے ہمراہ آئے اور ہم نے پوچھا کہ حکیم صاحب اب کیا ہوگا، حکیم صاحب نے ہم سے کہا کہ امید کم اور مایوسی زیادہ، گھر جا کر ایک دوا اور بھیجتا ہوں اگر ہوش آگیا تو بچ گئے، حکیم صاحب سوار ہوئے، صاحب عالم نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب کا بیان اعلیٰ حضرت کو لکھنا چاہئے اور یہ بھی لکھنا چاہئے کہ اب ڈاکٹروں کو بھیجئے: صاحب عالم نے مجھ سے کہا کہ آپ عرضی لکھیے، میں استاد کے پاس جا رہا تھا کہ مولانا نے مجھے آواز دی کہ نواب صاحب جلدی آئیے، میں اور عزیز یار جنگ، عبدالغنی خاں، مظفر علی، پیر جی جو باقی باللہ صاحب کے سجادہ ہیں اسی روز دہلی سے آئے تھے ہم چار دیں انکے کمرے میں گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ہاتھ کی حرکت بند ہوئی، ہم نے تکیہ نکالا اور پلنگ پر لٹایا، اس وقت ہم چاروں نے کلمۂ طیب

پڑھنا شروع کیا، استاد کے منہ سے اللہ اللہ اللہ جاری تھا لطیف جان نے رونا پیٹنا شروع کی، اللہ اللہ پر خاتمہ ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون

بھائی احسن آپ کی خاطر سے دل کو سنگ لاخ کر کے یہ حال اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اب باقی حالات پھر لکھوں گا قطعۂ تاریخ مزار پر کندہ کرانے کو میں نے یہ لکھا تھا اور سائل صاحب سے کہدیا تھا کہ تمامی شاگردوں کو بذریعہ اعلان اطلاع دینا چاہیے جس کی تاریخ بہتر ہو وہی کندہ ہو، سائل صاحب نے ایک نہ سنی اپنی تاریخ کندہ کرادی، میرا قطعہ یہ ہے:-

فصیح الملک جہاں استاد مرزا داغ — چو رخت بردہ بہ ملک بقا بحسن یقین
امیر از پئے تاریخ او بلوح مزار — ندا رسید بگو ہشتم مزار داغ ہمیں

قطعہ دیگر

چل بسے استاد داغ دہلوی — روتے ہیں انکے لئے پیر و جواں
اب نظر آتا نہیں ایسا کوئی — اہل دل اہل سخن اہل زباں
سالِ رحلت تم یہ کہدو اے امیرؔ
مردِ کامل بادشاہِ شاعراں

صاحب عالم صاحب کہتے تھے کہ کوئی صاحب تاریخیں جمع کر کے اسکی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں، میری تاریخیں آپ انہیں دیدیں۔ والسلام

میر حسن علی خاں امیر

آپ نے مرزا داغ کی وفات حسرت آیات کے بیچے اور چشم دید حالات پڑھ لئے اب آپ وہ سب حالات بھی سن لیجئے جو مرزا داغ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد گزرے، میر حسن علی خاں ہی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :—

۳ر شوال ۱۳۲۳ھ

یاد فرمائے من مہجور سلمہ اللہ الغفور، تسلیم

بھائی صاحب آپ نے جو میرے خط کا جواب زمانۂ دراز کے بعد عنایت کیا، مجھے بار بار یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ڈاک خانے والوں نے میرے خط کو تلف کر دیا ورنہ جواب میں اتنی مدت نہ ہوتی، خدا خدا کرکے اس وقت آپ کا الطاف نامہ مجھے ملا، جس کا جواب فوراً لکھ رہا ہوں، آپ کو استاد مرحوم کے مرض کے حالات اگرچہ میں نے لکھ دیئے ہیں مگر روزانہ جو واقعات گزرے وہ پورے پورے نہیں لکھے، اس کے لکھنے کے لئے میں مستعد ہوں بشرط آپ کا حکم۔ چند روز قبل صاحب عالم نے مجھ سے کہا کہ احسن صاحب بھائی صاحب کی بیماری کے حالات چاہتے ہیں، آپ ایک دن رہیں تو دونوں کے مشورے سے لکھے جائیں، میں نے جواب دیا کہ جو کچھ مجھے یاد تھے میں نے لکھ دیئے، میرے اس جواب پر وہ ناخوش ہوئے برایں ہم میں نے دو تین ورق اپنے ہاتھ سے لکھے تھے معلوم

نہیں انھوں نے آپ کو بھیجے یا نہیں، استاد مرحوم کا دیوان موسوم بہ "یادگارِ داغ" جس کا مسودہ اور مبیضہ استاد مرحوم کے کتب خانے میں رہا کرتا تھا، استاد کے انتقال کے بعد عبدالغنی کی شرکت سے سراج الدین خاں نے اپنے قبضے میں کر لیا، ایک دن لاڈلی بیگم نے مجھے اپنے پاس بلوا کر یہ کہا کہ آپ کو بجائے داغ صاحب کے جانتے ہیں آپ کو لازم تھا کہ داغ صاحب کے دفن کے بعد آپ داغ صاحب کی جگہ بیٹھ جاتے آپ نے تو مجھے پرسا بھی نہ دیا اسی قسم کی شکایت آمیز باتیں کرتی رہیں، تھوڑی دیر کے بعد میں نے لاڈلی بیگم سے پوچھا کہ کیا کمرے میں سراج الدین خاں ہیں انھوں نے جواب دیا کہ مجھے علم نہیں، میں حقہ پینے کی غرض سے چلا گیا دیکھا تو سراج الدین خاں تو نہیں ہیں، غلام رسول کاتب ملازم استاد مرحوم موجود ہے۔ اور "یادگارِ داغ" صاف ہو رہا ہے، میں نے اس کاتب سے پوچھا کہ یہ دیوان یہاں کیسے آیا، اس نے جواب میں جھوٹ بات یہ کہی کہ انتقال کے دو چار روز پیشتر مدار المہام کے یہاں مشاعرہ ہوا، اس مشاعرے میں سرکار سے مانگ کر لے گئے تھے، جب سے اب تک سراج الدین خاں کے پاس ہے، میں نے ان سے کہا کہ تم بالکل غلط کہتے ہو استاد نے ہرگز نہیں دیا، اس کے بعد اسی کاتب

سے میں نے کہا کہ میری طرف سے سراج الدین خاں کو کہہ دینا کہ یہ کام اچھا نہیں اس قسم کی بدعنوانیاں ہونگی تو فہمائش رنجش بڑھے گی، ابھی استاد مرحوم کو انتقال کئے چار روز گزرے ہیں اتنی جلدی دیوان کے صاف ہونے میں کیوں ہو رہی ہے، جب کل سامان کا تصفیہ ہوگا اس کا بھی ہوگا، یہ کہہ کر میں اپنے گھر چل دیا، سراج الدین خاں جب آئے تو کاتب نے ان سے میری کہی ہوئی باتیں کہیں، انہوں نے یقین کر لیا کہ اس نے صاحب عالم سے کہہ دیا ہوگا، مارے خوف کے وہ سیدھے صاحب عالم کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ چچا جان کا دیوان حضور میں گزراننے کے لئے صاف کروا رہا ہوں. صاحب عالم نے پوچھا کہ قفل میں سے کیونکر نکلا تو پھر انہوں نے وہی عذر پیش کیا کہ چچا جان نے مدارالمہام کے مشاعرے میں لے جانے کو چند روز قبل دیدیا تھا جب سے میرے ہی پاس ہے، صاحب عالم نے کہا کہ دیوان جہاں تھا وہیں رکھ دیا جائے اگر آپ کو نقل کرانی ہو تو روز نکالا جائے اور کاتب لکھے اور پھر وہیں رکھدے، انہوں نے صاحب عالم کے کہنے پر عمل نہیں کیا، صاحب عالم نے اعلیٰ حضرت کے پاس ایک عرضداشت اس مضمون کی لکھی کہ بھائی صاحب مرحوم کا دیوان "یادگار داغ" بقیمت

چار یا پانچ ہزار روپیہ بیچ رہے ہیں اسی بنا پر صاف کرا رہے ہیں، ساتھ ہی سرکار نے ناظم الملک یعنی محبوب یار جنگ بہادر کو حکم دیا کہ تم جا کر مسودہ اور مبیضہ دونوں لیتے آؤ اور یہ حکم ان کو سنا دو کہ سرکار اس کو چھپوائے گی، محبوب یار جنگ آئے اور دیوان لے کر داخل سرکار کیا، اب خدا ہی نکالے تو نکلے، میری رائے میں دیوان کے نکلنے کی یہی شکل ہے کہ استاد مرحوم کے جمیع تلامذہ مل کر ایک عرضداشت پیش کریں اور یہ عرضداشت صرف دیوان ہی کے لئے نہ ہو بلکہ استاد کے فاتحہ و درود سالانہ جاری ہونے کے لئے ہو اور اس کی سرپرستی کسی ایک شاگرد کو ملنی چاہئے، جب تو سارے کام نکلیں گے ورنہ ورثائے مرحوم سے کچھ نہ ہو سکے گا کیونکہ یہ لوگ کتوں کی طرح جھوٹی ہڈی پر لڑ رہے ہیں، استاد مرحوم کے دیوان کی ایک نقل آپ کے پاس ہے اور ایک بارق صاحب کے پاس اور ایک صاحبزادہ اعلیٰ حضرت کے پاس ہے اور ابھی ایک نقل سراج الدین خاں کے پاس ہے اس کا بجز میرے کسی کو علم نہیں ہے وہ نقل امراؤ مرزا کے ہاتھ کی اور میرے ہاتھ کی ہے، ان سب کے پاس تاریخات، قصائد متفرقات نہیں ہیں، یہ بھی بہت کچھ ہے، اب اس دیوان کا چھپوانا بلا اجازت اعلیٰ حضرت کس طرح ہو سکے گا، اعلیٰ حضرت کے پاس رجسٹری

خطوط برابر پہنچتے ہیں، معرفت مولوی احمد حسین صاحب سکتر، میری ناقص رائے میں کسی امر کی ہر ایک طرف سے گذارش مناسب نہیں ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ جمیع شاگردان استاد مرحوم کی طرف سے جو درخواست پیش ہوگی اس پر سرکار توجہ فرمائیں گے۔ انشاء اللہ تعالے میں اپنے خاندانی حالات اور فوٹو وغیرہ جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، گزرانتا ہوں بھائی صاحب، سراج الدین خاں کے حالات وغیرہ تو آپکے چشم دید ہیں آپ کو لکھنے کی کیا ضرورت ہے، میرے لڑکے کی شادی میں ایک سہرہ تو حافظ جلیل حسن صاحب جلیل نے لکھا ہے اور ایک سہرہ سید محمد صاحب اختر استاد بھائی نے اور ایک سہرہ مکرمی مرزا سراج الدین خاں نے لکھا ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں قابل ملاحظہ ہیں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ اودھم سنگھ سردار بہادر سکنہ امرتسر کون شخص ہیں اور کس پایہ کے آدمی ہیں وہ مجھ سے بعض واقعات ان مشاعروں کے پوچھتے ہیں جن میں استاد مرحوم شریک ہوئے تھے، میں کچھ حالات لکھ بھی رہا ہوں، ایک مشاعرے کا حال جو لکھنے بیٹھا تو ایک جزو بھر گیا، بھائی صاحب اتنی خط وکتابت مجھ سے نہیں ہو سکتی، باقی آئندہ، اگر آپ جواب میں تاخیر نہ فرماتے تو میں اور حالات لکھتا، سب مجھے

جواب نہ ملنے سے کچھ ناگوار ہوا، معاف فرمائیے۔

لاڈلی بیگم مجھ سے ایک روز کہنے لگیں کہ صاحب عالم سے کہہ کر دیوان آپ نے لکھوا دیا، مجکو ان کی یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی، اس روز سے ملنا ترک کر دیا، بھائی صاحب لاڈلی بیگم اچھی آدمی ہیں مگر مرزا سائل صاحب کے دام محبت میں گرفتار ہیں ناصر تو از حد ابتر ہو گیا ہے سنا ہے کہ اس مہینہ سے اپنی تنخواہ ناصر نے آپ لے لی ہے، آپ کو تو ان کے حالات خوب معلوم ہیں۔

میر حسن علی خاں امیر

ایک خط میر حسن علی خاں امیر نے ۹ محرم ۱۳۲۴ھ کو لکھا جس میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ کچھ حالات مرزا داغ سے متعلق بھی لکھے ہیں، مرزا داغ کی وفات کے بعد ان کے ورثا میں کافی اختلافات پیدا ہوئے، لاڈلی بیگم مدعی تھیں کہ مرزا صاحب کی آغوشی دختر ہیں، خورشید عالم موسوم بہ صاحب عالم دعویدار تھے کہ میں متوفی کا بھائی ہوں، حضرت سائل گھر داماد ہونے کی بنا پر ہی معاملے میں دخل رکھتے تھے، دعویدار تو اتنے تھے لیکن ان میں اہل ہنر کوئی نہیں تھا خورشید عالم شراب خوار و وارفتہ مزاج تھے، سائل صاحب جیسا کہ بعض تحریروں سے واضح ہوتا ہے مرزا داغ کی زندگی سے ہی دراز دستیوں کے عادی تھے۔ لاڈلی بیگم چونکہ سائل صاحب کا دم بھرتی تھیں اس لئے

مرزا صاحب کی وفات کے بعد گھر میں ایک عجیب بدنظمی پیدا ہو گئی، خود غرضیوں نے سب کو آگھیرا، ہر شخص ایک دوسرے پر اپنے حقوق اور اپنے استحقاق کو تفوق دیتا تھا، نتیجہ جس کا یہ ہوا کہ جس کے جو چیز ہاتھ آئی وہ اس پر قابض اور متصرف ہو گیا، یہ لوٹ مار دیکھ کر مکان میں قفل ڈال دیئے گئے، میر حسن علی خاں اپنے مذکورہ بالا خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"استاد مرحوم کے گھر کے قفل صاحب عالم بہادر نے کھول ڈالے، افسوس ہے کہ کچھ برآمد نہیں ہوا، سب مال اسباب جناب سائل صاحب لے گئے، فرش فروش الماریاں فرنیچر اور کتب خانہ چھوڑ گئے، جس قدر مال تھا وہ سب لے گئے، صاحب عالم بہادر نے قفل کرایہ کی زیر باری سے بچنے کیلئے کھول ڈالے۔ اس وقت دس بیس آدمی موجود تھے، کچھ نہ نکلا۔ دو چار دن میں مکان سے اٹھ جائیں گے، اعلیحضرت کی خدمت میں عرضی بھیجدی ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ داغ جیسے کنبہ پرور، عزیز نواز، اور مخلص ترین انسان کی آنکھیں بند ہوتے ہی انکے ان عزیزوں نے جو مدت العمران سے لگے لپٹے رہے، ان سے پورا پورا فیض اٹھایا کیسی آنکھیں پھیر لیں اور کتنی غیر شائستہ و انسانیت سوز حرکات کے وہ مرتکب ہوئے، واقعات گواہ ہیں کہ مرزا صاحب اپنی کمائی کا وافر حصہ ان لوگوں

پر صرف کیا کرتے تھے، خورشید عالم کو حقیقی بھائی، سائل صاحب کو بمنزلہ پسر حقیقی اور لاڈلی بیگم کو اپنی صلبی اولاد کی طرح سمجھتے تھے لیکن ان لوگوں نے ان کی اس محبت و خلوص کا جواب یہ دیا کہ ان کی، وفات کے بعد انکے اثاثے پر لوٹ مار شروع کر دی، لاڈلی بیگم کے پسر ناصر الدین خاں کی مرزا صاحب نے بڑے اعلیٰ پیمانے پر پرورش و پرداخت کی، وہ شاہزادوں کی طرح رہتے تھے، انہیں کی کسی تقریب میں خود نظام دکن میر محبوب علی خاں تشریف لائے تھے اور ناصر مرزا کے گلے میں ایک گراں قیمت ہار ڈال کر مرزا صاحب کو معزز فرمایا تھا، ایسے ماحول اور انداز میں پروان چڑھے ہوئے اخلاف نے مرزا صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد میں جو مثال قائم کی اس کا ذکر نہایت شرمناک ہے۔

مرزا صاحب کو ان لوگوں کی حرکات سے اپنی حیات ہی میں تکلیف پہونچنے لگی تھی اس حقیقت کے اثبات میں بھی میر حسن علی خاں امیرؔ کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے مورخہ ۸ رجمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو لکھی، انہوں نے بہت سی اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ:-

"ایک خط لاڈلی بیگم کا بھی آپ کے دیکھنے کو بھیجتا ہوں جس کے دیکھنے سے آپ کو بخوبی ظاہر ہو جائیگا کہ داغ مرحوم سراج الدین خاں سے کتنے ناراض تھے، مجھ سے تو اکثر کہا کرتے تھے کہ ان سب کی صورت سور کی معلوم ہوتی

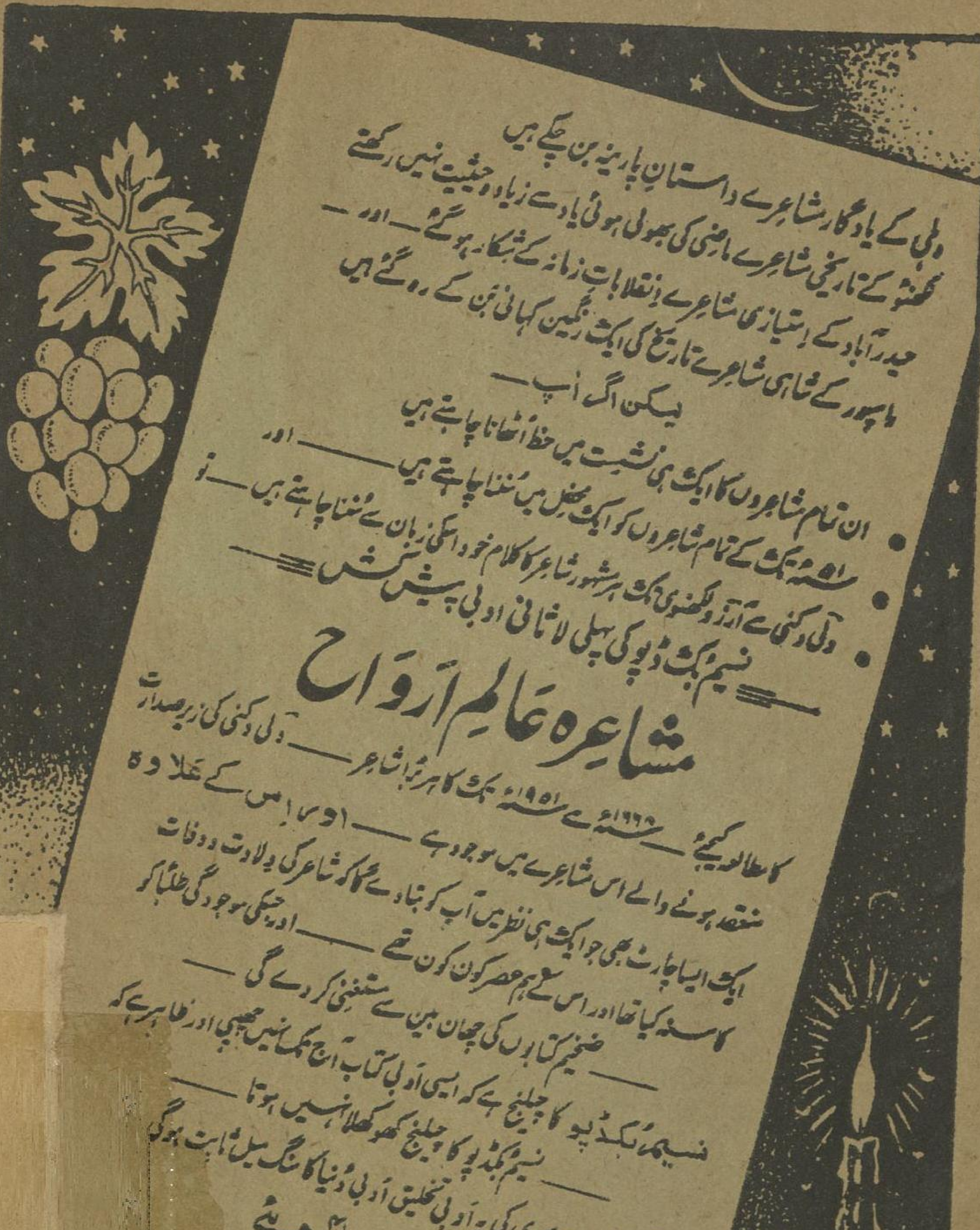
ہے اور بہت سے ابواب میں لکھنے کو دفتر درکار ہے، آپ کو بھی تھوڑا سا معلوم ہے جو ایک دفعہ استاد مرحوم نے آپ سے کہدیا تھا کہ سراج الدین کے یہاں نہ جایا کرو۔"

زبان داغ

داستان حسن و عشق دہرانے والے شعراء میں آج کتنے شاعر ایسے ہیں جنہوں نے خیالی محبت اور افسانوی عشق سے آگے کچھ عملی اقدام بھی کئے ہوں اور اقوال و بیان سے ہٹ کر اپنے عمل و کردار سے بھی عشق و محبت کی داد پائی ہو۔ ایسے شعراء میں نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا نام پیش پیش ہے! انہوں نے بحیثیت شاعر زبان و بیان کی جو گلکاریاں اردو ادب کے دامن پر کیں محتاج بیان نہیں۔ وہ غزل کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے خیالی و تصوراتی معاشقہ و محبت سے قطع نظر عملی طور سے بھی حسن و عشق کی پذیرائی فرمائی چنانچہ نظم میں فریاد داغ جیسی مثنوی ان کے ایک ایسے ہی معاشقہ کی بالکل سچی داستان ہے لیکن شاعرانہ تلمیحات اور مبالغوں نے مرزا داغ اور انکے مطلوب کے چہروں پر ہلکے پردے ڈال رکھے ہیں اور ایک بالکل سچا واقعہ بعض مقامات پر بالکل فرضی سا معلوم ہونے لگتا ہے اور ہندوستان کے اس مشہور شاعر کے مذاق حسن کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔

آپکو مرزا داغ جیسے مقبول ترین شاعر سے متعلق حسن و عشق کے کچھ اذکار دیکھنا ہوں تو سید رفیق مارہروی کی تازہ تالیف **زبان داغ** ملاحظہ فرمایئے جسمیں مرزا داغ کے ۲۵۰ ایسے خطوط دیئے گئے ہیں جو انہوں نے ہندوستان کے بعض رؤساء و امراء، احباب اعزا اور شاگردوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوط کا وہ حصہ سب سے زیادہ جاذب توجہ اور دلچسپ ہے جسکے مخاطب "ارباب نشاط" ہیں۔ منی بائی حجاب، نبی جان، ملکہ جان اور گوہر جان کے نام مرزا داغ نے کچھ ایسے دلچسپ خطوط لکھے ہیں کہ داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ زبان و بیان کے دلپذیر انداز اور عشق و محبت کے دلگداز انداز بیان کی بہترین مثالیں اگر ملاحظہ کرنی ہوں تو ان خطوط کو ضرور پڑھیئے۔ ان نایاب و دلچسپ خطوط کی اشاعت کا فخر نسیم بک ڈپو لکھنؤ کو حاصل ہے کتاب بہترین چھپائی لکھائی کی حامل ہے خوبصورت جلد پر سہ رنگا گرد پوش ہے جس پر داغ اور منی بائی حجاب کی خوش رنگ تصویریں ہیں۔

قیمت صرف -/8/3 RS 3/8/-


دلی کے یادگار شاعرے داستانِ پارینہ بن چکے ہیں
لکھنؤ کے تاریخی شاعرے ماضی کی بھولی ہوئی یاد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے
حیدرآباد کے امتیازی شاعرے انقلاباتِ زمانہ کے شکار ہو گئے —— اور
رامپور کے شاہی شاعرے تاریخ کی ایک رنگین کہانی بن کے رہ گئے ہیں
لیکن اگر آپ ——
ان تمام شاعروں کا ایک ہی نشست میں حظ اٹھانا چاہتے ہیں
۱۳۷۰ھ تک کے تمام شاعروں کو ایک محفل میں سننا چاہتے ہیں —— اور
ولی دکنی سے آرزو لکھنوی تک ہر مشہور شاعر کا کلام خود اسکی زبان سے سننا چاہتے ہیں —— تو
نسیم بک ڈپو کی پہلی لاثانی ادبی پیشکش
مشاعرہ عالمِ ارواح
ولی دکنی کی زیر صدارت
۱۳۸۵ھ ۱۹۵۱ء تک کا ہر بڑا شاعر
۱۹۶۶ء سے —— کا مطالعہ کیجیئے
اور اس کے علاوہ —— موجود ہے
منعقد ہونے والے اس شاعرے میں
ایک ایسا چارٹ بھی جو ایک ہی نظر میں آپ کو بتادے گا کہ شاعر کی ولادت و وفات
کا سنہ کیا تھا اور اس کے ہم عصر کون کون تھے —— اور جسکی موجودگی طلبا کو
ضخیم کتابوں کی چھان بین سے مستغنی کردے گی ——
نسیم بکڈپو کا چیلنج ہے کہ ایسی ادبی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی اور ظاہر ہے کہ
نسیم بکڈپو کا چیلنج کبھو کھلا نہیں ہوتا ——
سید مرتضیٰ حسین موسوی کی یہ ادبی تخلیق ادبی دنیا کا سنگ میل ثابت ہوگی ——
قیمت —— چار روپئے
IMTIAZ